تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

جلد04 | شمارہ 03 | ماہ مارچ 2019ء

سرپرست
محمد رحیم الدین انصاری
صدر نشین تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
محمد عبدالوحید
ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ قومی زبان، صدر دفتر تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی، چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد 001 500 تلنگانہ اسٹیٹ۔ اِنڈیا

Printed by Md. Abdul Waheed and Published by Md. Abdul Waheed
on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana,
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging ,
11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul,500 0 04 Hyderabad, T.S.
Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931 **Email:** qaumizaban.tsua2015@gmail.com

ماہنامہ

قومی زبان

مدیر	:	محمد عبدالوحید، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ناشر و طابع	:	محمد عبدالوحید، ناظم / معتمد تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی
ترتیب و تزئین	:	محمد ارشد مبین زبیری
سرورق	:	سید مجیب الدین
طباعت	:	طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، عابڈس، حیدرآباد
ماہ	:	مارچ 2019ء
جلد	:	چہارم
شمارہ	:	(03)
استحقاق	:	تمام حقوق تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کی تحویل میں ہیں
مبادلہ ماہانہ	:	15-00 (پندرہ) روپے
مبادلہ سالانہ	:	150-00 (ایک سو پچاس) روپے

قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

قرینہ

ہم کلامی	:	پروفیسر ایس اے شکور	6
مضامین :			
غیر منقوط کلام (نظم و نثر) ایک مطالعہ)	:	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	7
اُردو میں سوانح نگاری	:	ڈاکٹر معید جاوید	15
حیدرآباد کے ممتاز شاعر ''سکندر علی وجدؔ	:	مجید صدیقی	19
سرسید احمد خان کی صحافتی خدمات	:	محمد یوسف شاشی	28
پروفیسر محمد علی اثر کے وضاحتی اشاریے	:	فہمیدہ بیگم	34
گوشۂ خواتین :			
لطف النساء امتیاز بحیثیت مثنوی گو شاعر	:	ڈاکٹر نوری خاتون	38
عصمت چغتائی کے افسانوں میں مسائلِ نسواں کی بازگشت	:	محمد سرور لون	46
ادبِ اطفال :			
عصرِ حاضر میں بچوں کا ادب اور بچوں کے مسائل	:	ڈاکٹر عزیز سہیل	53
ادبِ اطفال اور علامہ اقبال	:	ڈاکٹر شیخ عمران	59
طنز و مزاح :			
انداز اپنا اپنا	:	پروفیسر حبیب ضیاء	63
بنتِ حوّا کہاں جائے؟	:	شہانہ اقبال	66
افسانے :			
گندم کی برکت	:	ڈاکٹر سعید بن مخاشن	70
بے زمینی کا المیہ	:	ڈاکٹر علی عباس	75
حصہ نظم :			
غزلیں	:	ڈاکٹر مسعود جعفری	78
غزلیں	:	انجم شافعی	79
غزلیں	:	اقبال شیدائی	80
غزلیں	:	کوکب ذکی	81
غزلیں	:	کشور سلطانہ	82

oOo

ہم کلامی

ماہنامہ قومی زبان کا ماہ مارچ 2019ء کا شمارہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔اس رسالے میں ممتاز ادیبوں' اسکالرس' مزاح نگار وافسانہ نگاران کے کارآمد' معلوماتی مضامین' طنز ومزاح سے بھرپور مضامین وافسانے' شعرائے کرام کے کلام شائع کئے گئے ہیں۔امید کہ یہ نگارشات ہمارے بلند فکر وخوش ذوق قارئین کے لئے معلومات میں اضافہ اوران کی تفریح طبع کا باعث بنیں گے۔

میں نے اسی ماہ تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر/سکریٹری کی حیثیت سے جائزہ حاصل کیا ہے۔مجھے اس بات پر فخر ہے کہ ڈائرکٹر/سکریٹری کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اُردو اکیڈیمی کے علمی' ادبی' لسانی' فنی وسائنسی جریدہ ماہنامہ قومی زبان کی ادارت کی ذمہ داری بھی مجھے سونپی گئی ہے' میری کوشش رہے گی کہ اس رسالے کو مزید معیاری بنایا جائے اوراردو زبان وادب کے فروغ' ترقی وترویج کی کوششوں میں مزید پیش رفت ہو۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ حکومت تلنگانہ نے ریاست میں اُردو اکیڈیمی کی ترقی وترویج کی کوششوں میں مزید اضافہ کے لئے ایک ادب دوست شخصیت محترم جناب محمد رحیم الدین انصاری صاحب کو تلنگانہ اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا صدرنشین مقرر کیا ہے۔ موصوف کی قیادت میں تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی اپنی اسکیمات وپروگرامس کو روبہ عمل لانے کی کوشش کررہی ہے۔مجھے امید ہے کہ محترم صدرنشین کی سرپرستی ورہنمائی میں اُردو اکیڈیمی مزید پروان چڑھے گی اوراردو زبان وادب کی ترقی وترویج کے سلسلہ میں مزید نئی اسکیمات وپروگرامس متعارف ہوں گے۔

یہ بات ہمارے محبان اُردو کے علم میں ہے کہ اُردو اکیڈیمی کے مقاصد میں تعلیمی ادبی وشعری خدمات انجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی بھی شامل ہے' اس خصوص میں اُردو اکیڈیمی کی اسکیم'' کارنامہ حیات ایوارڈ'' جاری ہے جس کے ذریعہ مختلف زمروں کے خدمت گذاروں کو ایوارڈ سے نوازا جاتا ہے۔اس کے علاوہ فروغ اردو کی دیگر اسکیمات جن میں مولانا آزاد ایوارڈ' مخدوم ایوارڈ' مطبوعات پر انعامات' بیسٹ اردو ٹیچر وبیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈز اردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت' چھوٹے اردو اخبارات کی مالی اعانت' پرنٹ والیکٹرانک میڈیا' صحافیوں' ادیبوں' شعرائے کرام کی حوصلہ افزائی اوراردو زبان کی ترقی و ترویج کی دیگر اسکیمات کا اپنے اپنے وقت پر پوری شفافیت کے ساتھ تکمیل کو پہنچانا اردو اکیڈیمی کا نصب العین ہے۔

بہرحال میری کوشش رہے گی کہ اردو زبان وادب کی ترقی کا عمل جاری وساری رہے بلکہ اس میں مزید تیزی آئے اوراس زبان کو باقی وزندہ رکھنے کی کوشش بھی جاری رہے۔اس خصوص میں آپ سب کا تعاون درکار ہے۔اپنی قیمتی آراء سے نوازتے رہیے۔

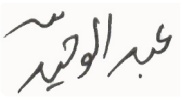

محمد عبدالوحید

ایڈیٹر

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
(سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی)

غیر منقوط کلام (نظم ونثر ایک مطالعہ)

رَبِّ کائنات ،خلاّقِ مطلق نے انسان کو زبان جیسی عظیم نعمت سے سرفراز کیا' وہیں اس پروردگار حقیقی نے تحریر یا لکھنے لکھانے کی دولت سے بھی نوازا' اور شاید یہ فن تحریر کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ انسان تہذیب وشائستگی سے آشنا ہوسکا۔ رسم خط کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کے موجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں ۔انہوں نے اپنی وفات سے تین سوسال قبل رسوم خط کچی اینٹوں پر ثبت کر کے،ان کو آگ میں پکا کر زمین میں دفن کردیا تھا' طوفان نوح علیہ السلام کے بعد جب یہ اینٹیں برآمد ہوئیں تو ان کے نقوش کو رسم خط قرار دیا گیا' بحوالہ صحیفہ خوش نویساں اژرنگ چین کے مصنف نے حضرت ادریس علیہ السلام کو موجد خط قرار دیا ہے' مزید ''تحقیقات ماہرؔ'' از حکیم محمود علی خاں ماہرؔ کے بموجب رسم خط کے موجد قبیلہ بولان کے تین اشخاص سرزمین انبار (عراق) کے مرامر بن مرّہ' اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ ہیں ۔(فتوح البلدان ص۴۷۹) بعدازاں طمس کے باشندوں نے ابجؔد کی ایجاد میں دلچسپی دکھائی۔ ایک روایت کی رو سے حمیر، جدیس، طسم' ارم اور حویل عربی زبان کی اصل لغت ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اہل عرب سے اخذ کئے ۔غرض رسم خط کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ کوئی پندرہ ہزار برس قبل مسیح علیہ السلام مصریوں نے اپنے افکار وخیالات کو ظاہر نے کے لئے ایک رسم خط ایجاد کیا جس کے لئے انہوں نے انسانی اور حیوانی شکلوں سے کام لیا ،ظہور اسلام کے وقت عرب خصوصاً مکہ معظّمہ میں کوئی پندرہ یا سترہ افراد کتابت سے واقف تھے۔(صحیفہ خوش نویساں ص ۳۷)' یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ زبان بلاشبہ خیالات وجذبات کے اظہار کا سب سے پہلا اور اچھا ذریعہ ہے۔ اس سلسلے میں آواز کے زیر وبم کے بعد تحریر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' اب تحریر کی اقسام پر توجہ کریں تو اندازہ ہوگا اس کے مختلف طریقے باہمی رشتوں میں استحکام پیدا کرتے ہیں ۔ مجھے یہاں رسم خط کی مختلف شکلیں یا ان کے طریق کار سے بحث نہیں' البتہ رسم خط میں اس کی چند صورتوں سے متعلق چند ایک باتیں اختصار سے گوش گذار کرنی ہیں۔خصوصیت سے غیر منقوط کلام (نظم ونثر) کی صناعی کے بارے میں رسم خط کے فروغ اور ارتقاء کے طول طویل عرصے میں ماہرین وخوشنویسوں نے کئی ایک خط ایجاد کیے جس کے سلسلے

میں حضرت مولانا جامؔی علیہ الرّحمہ کے یہ چار مصرعے یاد رکھنا ضروری ہے:

کاتباں راہفت خط باشد بطرز مختلف
ثلث وریحان ومحقق، نسخ و توفیق ورقاع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہل عجم
از خط توقیع استنباط کردند، اختراع

اس طرح کئی ایک خطوں کے درمیان خوشنما خطوط اور خطوط مرموزہ یعنی وہ رسم خط جو دانشوران عہد کی جودت طبع کا نتیجہ ہیں اور جن کی وجہ ایجاد اخفائے راز ہے، یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کتابت کا علم قدرت کی عطا ہے، اگر یہ نعمت انسانوں کو حاصل نہیں ہوتی تو وہ دین و دنیا کے معاملات (کاروبار) سے یکسر نابلد و ناواقف رہتے۔ قرآن مجید میں سورۂ القلم موجود ہے جس کی ابتداء ہی ن، والقلم ومایسطرون (قسم ہے قلم اور اس کے لکھے کی) سے ہوئی ہے اور پھر سورۂ العلق میں ارشاد خداوندی ہے'' الذی علم بالقلم'' (جس نے علم سکھایا قلم سے)۔ اس طرح رسول اکرم ﷺ کے عہد میں خط کوفی کا رواج تھا اور آپ رسالت مآب ﷺ نے اسی خط میں مراسلت بھی فرمائی۔ ۶۷ ہجری میں سلاطین اور سرداروں کے نام جو خطوط لکھے اور جنہیں حضرت علی کرم اللہ وجہ نے تحریر کیا تھا، اس وقت حروف پر نقطے اور اعراب نہ تھے، حروف پر نقطے اور اعراب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد ابوالاسود دُوئلی نے ۵۰ ھ میں عہد بنی امیہ خصوصاً حجاج ابن یوسف کی ایماء پر نقطوں کی شکل میں اعراب ایجاد کئے گئے۔ چنانچہ باب علم نبی ﷺ حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجہ نے کسی موقع پر ایک ایسا ہی عالیشان خطبہ عنایت فرمایا جو غیر منقوط یا الخالیۃ من النقطۃ ہے اس خطبہ کو حضرت ابومخنف نے حارث الاعور سے روایت کیا ہے:

''الحمد للہ الملک المحمود، والمالک الودود، مصور کل مولود، مآل کل مطرود، ساطع المہاد و موطہ الاوطاد ومرسل الامطار ومسہل الاوطار. عالم الاسرار و مدرکہا ومدمر الاملاک ومہلکہا ومکور الدہور ومکررہا وموردالأمور و مصدرہا عمّ سماحہ وکمل رکامہ وہمل وطاد ع السؤال والامل أوسع الرمل وأرمل أحمدہ حمداًممدوداً و اوحدہ کما وحد الأواہ وہو اللہ لاالہ لّلامم سواہ ولاصادع لماعدّلہ وسوّاہ أرسل محمداًعلماللاسلام وإماما للحکام ومسدداً للدعاومعطل أحکام ودوسواع أعلم وعلم وحکم وأحکم اصل الأصول ومہد و أکدالموعود و أوعد، أوصل اللہ لہ الاکرام وأودع روحہ السلام ورحم آلہ واہلہ الکرام، مالمع رائل وملع دال وطلع ہلال وسمع اہلال ...الخ.

(خطبتان للامام امیر المومنینؓ۔ص ۳۷ تا ۳۹)

مخفی مبادلہ سیرۃ رسول کے سلسلہ میں عربی کے متعدد علماء وشعراء نے بیان واظہار کے لئے طرح طرح کے اسلوب اختیار کئے۔ کسی نے قافیہ بند نثر لکھی، کسی نے دوسری ادبی صنعتوں کا استعمال کیا۔ انہی میں غیر منقوط تحریر بھی اپنا

ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ابوالقاسم حریریؔ کی ''مقامات'' کا اٹھائیسواں مقامہ ایک ایسے ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو غیر منقوط ہے بلکہ حریریؔ نے اس سے بھی زیادہ مشکل ایک ایسی صنعت کا مظاہرہ اپنے انیسویں مقامہ میں کیا ہے جس میں ایک خط اس التزام کے ساتھ لکھا کہ اس کا ایک لفظ نقطوں سے یکسر خالی اور دوسرے لفظ کے ہر حرف پر نقطے ہیں اور یہ پابندی از ابتداء تا انتہا برقرار رکھی ہے۔

اُردو زبان شعروادب کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اس زبان کے تشکیلی دور میں ہی مختلف سخن کے ساتھ ساتھ نت نئی صنعتوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ تفصیلات کے قطع نظر دکنی زبان (اُردو) کے آخری روایت کے زمانے میں جبکہ اس پر شمالی ہند کا اثر غالب ہو چلا تھا' دکن کے شاعر قاضی محمود بحریؔ (ن ۱۱۳۰ھ' م ۱۷۱۷ء) قادرالکلام شاعر کے ہاں ایک غزل صنعت مہملہ میں ملتی ہے جس کا ایک شعر یوں ہے:۔

موحد کا معمہ کھول محمودؔ
احد، احمد اگر ہوگا ہمارا

انہی کے ہمعصروں میں شاہ قاسم اورنگ آبادی کا یہ شعر بھی دیکھئے:۔

در دوعالم رکھ دلا ہر دم سدا
آسرا دلدار، کرم اللہ کا

تاریخی اعتبار سے ہندوستان میں زبان وادب کے ساتھ کتابت یا خطاطی کی شروعات یوں تو قطب الدین ایبک سے ہوئی' لیکن عہد مغلیہ میں اس کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ بانی سلطنت ظہیرالدین بابرؔ سے لے کر بہادر شاہ ظفرؔ تک کم وبیش سالار بادشاہ اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ جلال الدین محمد اکبر کے کے عہد میں اس فن میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ شہنشاہ اکبر بیشتر خطاط کو زر و جواہر کے علاوہ خطابات سے نوازتا تھا۔ اس کے نورتنوں میں فیضی ابن مبارک نے ۱۵۹۳ء میں صنعت غیر منقوط یا صنعت مہملہ یا پھر نثر معریٰ میں قرآن مجید کی تفسیر بعنوان ''سواطع الالہام'' تحریر کی لیکن یہ بہ زبان فارسی (محمد اکرام، رودکوثر' ص:۱۳۵)۔ اس طرح شہنشاہ جہانگیر اور دور شاہ جہانی خطاطی کے لحاظ سے سنہری دور کہلاتا ہے۔ شاید یہی وہ دور ہے جب ''اُردوئے معلیٰ'' نے اپنے قدم مضبوطی سے جمانا شروع کئے اور پھر اورنگ عالمگیر کے بعد سے فارسی کے پہلو بہ پہلو اردو شعروادب نے بھی عروج وارتقاء کی کئی منزلیں طے کیں لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال نے صاحبان علم وفن کو لکھنؤ' رامپور اور دکن جانے پر مجبور کردیا۔ خود اورنگ زیب نے دکن میں بیجاپور کے عادل شاہوں اور ساتھ ہی حکومت گولکنڈہ کے قطب شاہوں کو شکست دے کر ان سلطنتوں کو تہس نہس کردیا تھا۔ اُدھر لکھنو (اودھ) اور رامپور کے نوابین بھی اپنی الگ شناخت وشاہی کو مستحکم کرنے میں لگے رہے۔ دہلی کی علمی وادبی فضاء مکدر بلکہ خستہ وخراب ہو چلی تھی جبکہ اودھ میں شعراء ادباء اور فنکاروں کی قدردانی کا اہتمام نظر آنے لگا۔ میر تقی میرؔ کے بعد کئی شاعر اودھ لکھنو چلے آئے' انہی میں ایک صاحب طرز شاعر سوداؔ اور پھر انشاء اللہ خان انشاء بھی وارد لکھنو ہوئے۔ تاریخی

لحاظ سے انشاء فن انشاء نگاری کی قلمرو میں بادشاہ علی الاطلاق تھے' اس اعتبار سے ان کو اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ انشاء کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے دیوان کے علاوہ دریائے لطافت رانی کتیکئی کی کہانی کے ساتھ ساتھ ایک مکمل کتاب سلک گہر، صنعت معری یا صنعت غیر منقوط میں لکھی جو آپ اپنا جواب تھی۔ منشوی کا سال تصنیف انشاء نے یوں بیان کیا ہے:

کردم سالِ درا محرر
طور الاسرار و سطر گوہر

اسی طرح میر ببر علی انیسؔ لکھنوی اپنی موروثی شاعرانہ عظمتوں کے ساتھ بساط شعر و سخن پر چھا گئے۔ مرثیہ گوئی میں ان کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ ان کے ہم عصروں میں مرزا سلامت علی دبیرؔ کا نام بھی اپنے پورے طمطراق سے ابھر آتا ہے۔ ان دونوں شاعروں نے صنعت مہملہ یا غیر منقوط میں مراثی تحریر کئے۔ چونکہ گفتگو یا موضوع غیر منقوط یا نظم و نثر معریٰ ہے اس لئے بحوالہ بحر الفصاحت یہاں اول دبیرؔ کے چند اشعار اور اس کے بعد انیسؔ کے غیر منقوط اشعار درج کئے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ دبیرؔ نے اس صنعت میں تین سو شعر پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا۔ اس کا یہ شعر دیکھئے:۔

ہم طالع ہُما مراد ہم رسا ہوا
طاؤس کلک مدح اُڑا اور ہُما ہوا

ایک دوسرے مرثیہ کا ایک بند دیکھئے:۔

اول سُرور دل کو ہوا اس دم وہ کام کر
ہر اہلِ دل ہو محو' وہ مدح امام کر
حاصل صلہ کلام کا دارالسلام کر
کر اس محل کو طور وہ اس دم کلام کر

حضرت انیسؔ کے مرثیہ کے اشعار دیکھئے:۔

اس طرح کا والا ہم اس طرح کا سردار
اس طرح کا عالم کا ممد اور مددگار
وہ مصدر الہام احد محرم اسرار
وہ اصلِ اصول کرمِ داور و داور
حاصل اگر اک مردِ دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسداللہ کو مارا

انشاء اللہ خان انشاء نے ایک مکمل دیوان اسی صنعت غیر منقوط میں لکھا، اس کی ابتدائی بیت درج ذیل ہے:۔

اور کس کا آسرا ہو سرگردہ اس راہ کا
آسرا اللہ اور آل رسول اللہ کا
سلسلہ گر کلام کا وا ہو
سامع دردِ دل کو سودا ہو
دل کو سَو سَو طرح سُرور ہو آہ
وہ دلارام گر ہمارا' ہو

اس دیوان کے علاوہ ان کی ایک مثنوی بھی نظم معریٰ میں ہے اور ایک قصیدۂ منقبت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی لکھا جس کا سرعنوان طور الکلام ہے:۔

وہ مرد معرکہ آزاد دور کوہ اُحد
دلاور ہمہ عالم محرک اعلام

(انشاء اللہ خان انشاء عہد و فن ص ۱۹) از اسلم پرویز

یہاں ایک دلچسپ بات بھی گوش گزار کردوں کہ جس طرح غیر منقوط صنعت نے اپنا کمال دکھایا' اسی طرح ماہرین نے صنعتِ منقوط کا اہتمام کیا یعنی اس میں تمام حروف ایسے لائے جائیں کہ سب نقطہ دار ہوں۔ یہ طرز نگارش فارسی اور عربی میں بھی بہت مشکل ہے' اُردو میں زیادہ دشوار ہے۔ یہاں محض غلام امام شہیدؔ کا یہ فقرہ بطور مثال درج کیا جاتا ہے:۔

''مشفقی شیخ فیض بخش چشتی نے جتنے تخت یشب بخشے، بخشی جی نے بنے بنے تخت چُن چُن بیچے' جب تین تخت بچے، تب نہ بیچے (''بحرالفصاحت'' ص:۹۷۸)

انیسویں صدی عیسوی کا وسط یا غدر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد دہلی کی تباہی بربادی نے عوام وخواص کے حواس باختہ کردیے اور پھر بیسویں صدی عیسوی کے آتے آتے جنوب کی آصف جاہی حکومت بھی مضبوط ومستحکم ہوگئی۔ خصوصاً حیدرآباد کی تہذیبی وثقافتی زندگی اپنے عروج واوج پر پہنچ گئی تھی' چونکہ اٹھارویں عیسوی ۱۷۲۴ء میں نواب میر قمرالدین خان آصف جاہ اول نے اورنگ آباد کو پایہ تخت بنایا لیکن بعد میں نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی نے حیدرآباد کو دارالخلافہ قرار دیا' تب یہ جگہ علوم وفنون کا مرکز بن گئی۔ یہاں خطاطی کی بھی غیر معمولی سرپرستی کی گئی۔ حیدرآباد کے کتب خانوں میں آصف جاہی دور کے بے حد اور نادر نمونہ جات دستیاب ہیں۔ حیدرآباد دکن میں تصنیف وتالیف اور شاعری کا شہرہ عام تھا' اس کے علاوہ تاریخ گوئی کی بھی گرم بازاری تھی۔ چنانچہ حکیم میر نادر علی رعدؔ فرزند حضرت شعلہؔ ابن حضرت شہید دہلویؔ نے مادۂ ہائے تواریخ کے استخراج کے لئے ایک کتاب گنجینہ تواریخ ترتیب دی' اس میں حضرت شعلہؔ نے جناب حبیبؔ کنتوری کے دیوانوں پر صنعت مہملہ یا غیر منقوط میں ایک تقریظ (فارسی) تحریر کی جو بجائے خود ایک کمال اور استعداد وقابلیت کا اظہار ہے۔

حمد داور دادار را سرودم وسر در درگاہ او سودم'
اللھم صل وسلم علیٰ محمد ﷺ وآلہ المکرّم کہ سراسر کلام مدوحم را مطالعہ کردم، دلم سرور حاصل کردو ہمہ مراد کامل۔ الخ۔

اس طرح کی کئی مثالیں موجودہ عہد میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دور کیوں جائیے آج سے کوئی پینتیس برس قبل یعنی ۱۹۸۲ء میں اسی صنعت غیر منقوط یا اردوئے معریٰ میں ایک مکمل کتاب بعنوان ''ہادی عالم'' (سیرۃ مبارکہ حضور سرورکونین ﷺ) از محمد ولی (رازی) منصۂ الشہود پر آئی۔ بقول حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحیٔ:۔

''ہادی عالم'' اپنی شان انفرادیت کا ایک عجیب شاہکار ہے۔ کتاب کافی ضخیم ہے اور تقریباً سوا چار سو صفحات اور پونے دوسو عنوانات پر مشتمل ہے۔ نیز بیشتر لوازمات سیرت نگاری سے متصف ہوتے ہوئے اپنے انداز کی ندرت وجدت کے اعتبار سے زبانِ اُردو کے خزینہ ادب کے لئے سرمایہ فخر ومباہات ہے' اس کتاب میں ملہمانہ خصوصیت یہ ہے کہ ابتداء سے انتہا تک جس قدر مضامین معرضِ تحریر میں آئے ہیں ان کے کسی حرف پر بھی نقطہ نہیں ہے۔ یعنی پوری کتاب صنعت غیر منقوط نویسی

سے مرصع ومزین ہے۔ اس کے علاوہ کسی جملے میں یا ربط عبارت میں یا بیان کی سلاست وروانی میں یا مفہوم کی ادائیگی میں یا واقعات کی تفصیل میں کہیں بھی کسی مقام پر بھی کوئی خلش یا ابہام نہیں ہے''۔(ص:۴' ہادیٔ عالم)

مصنف 'ہادیٔ عالم' محمد ولی رازی محترم بزرگ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کے صاحبزادے ہیں۔ اس کتاب پر حکومت پاکستان نے انہیں سند امتیاز سے اعزاز بخشا' انہوں نے ہادیٔ عالم کے ابتدائی صفحہ پر لکھا:

''سرور دو عالم صلی اللہ وعلیٰ رسولہ وسلم کے احوال کا حامل اُردو کا وہ واحد رسالہ کہ اس کی ہر سطر پر حکمہ ''اردوئے معریٰ'' سے مُرصع ہے اور علمی طور پر محکم ہے''۔

مزید سرکار دو عالم ﷺ سرور کائنات کی ولادت باسعادت کا یہ تذکرہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

''اللہ اللہ! وہ رسول اُمم مولود ہوا کہ اس کے لئے صدہا سال لوگ دعا گو رہے' اہل عالم کی مرادوں کی سحر ہوئی' دلوں کی کلی کھلی' گمراہوں کو ہادی ملا' گلّے کو راعی ملا' ٹوٹے دلوں کو سہارا ہوا' اہل درد کو درماں ملا' گمراہ حاکموں کے محل گرے' سال ہا سال کی دہکی ہوئی وہ آگ مٹ کے رہی کہ لاکھوں لوگ اس کو اِلٰہ کر کے اس کے آگے سر ٹکائے رہے اور رودِ ساوہ ماءرواں سے محروم ہوا۔

یہی نہیں ابتدائیہ کے بطور ''سطور اول'' کے عنوان سے اپنے معروضات یوں پیش کئے ہیں۔

''اللہ کے اسم سے کہ عام رحم والا، کمال رحم والا ہے۔ اس کم علم وکم آگاہ کو احساس ہے کہ ہادی کامل صلی اللہ علیہ علیٰ رسولہ وسلم کے احوال مطہرہ کے حامل کسی رسالے کی حامل کسی رسالے کی لکھائی ایک اہم علمی معاملہ ہے اور اہل علم ہی کا کام ہے اس کم علم کو اس کا حوصلہ کہاں؟ مگر اللہ کی درگاہ، کرم وعطا کی درگاہ ہے۔ اس کا کرم حدود سے ماوراء اور لامحدود ہے اور اس کی عطا ہر کسی کے کئے عام ہے۔ اگر اس کا ارادہ ہو' وہ مٹی کو گوہر کر دے اور محروم کو مالا مال۔ کرم ہی کرم ہے اس مالک الملک کا اور واسطہ ہے اس رسول اکرم کا کہ سرور عالم صلی اللہ رسولہ وسلم کے ہر حال کی لکھائی سہل ہوگئی (ہادیٔ عالم' از: محمد ولی رازی' ص:۳۱)

ماضی قریب میں چند ایک شعراء نے بھی اس طرز سخن کی جانب توجہ کی جیسے دلور آم کوثری نے اپنے نعتیہ مجموعہ'' ہندو کی نعت'' میں لکھا کہ انہوں نے ایک دیوان غیر منقوط ردیف وار محمد اور آل محمد کی مدح میں لکھا ہے' جس میں تخلص کوثری کی بجائے رام جو غیر منقوط ہے کا استعمال کیا ہے' اس کے علاوہ شہید فتح پوری کی ایک غیر منقوط نعت ماہنامہ گگن ممبئی ۱۹۸۴ء میں بطرز مثنوی شائع ہوئی۔ مقطع میں انہوں نے تخلص کی بجائے ہندی میں اس کے ہم معنیٰ غیر منقوط لفظ ''امر'' کا استعمال کیا ہے:۔

درود مسلسل سلام مسلسل
کہ ہو دل کا حاصل دوام مسلسل
آل دو عالم امام دو عالم
محمد کو ہر دم سلام دو عالم

(مذاہب عالم نمبر' ص:۵۵۶)

ادھر حیدرآباد کے ایک ذی علم صاحب قلم شاہ فصیح الدین نظامی نے اُردوئے معریٰ میں ایک کتاب ''لوامع الکلم'' (مضامین کا مجموعہ) لکھی' اس میں شامل ایک مضمون جوعلامہ حضرت عبداللہ قریشی الازہری خطیب مکہ مسجد کے سانحہ ارتحال پر تحریر کیا گیا' اس کا ایک اقتباس پیش ہے:

''ساری حمد اللہ کے واسطے ہے کہ وہ کل عالموں کا مالک ہے اور صد ہا درود سلام امام رسولاں محمد رسول اللہ صلی اللہ رسولہ وسلم کو وہ دائمی رسول اور سارے عالموں کے لئے رحم وکرم کے اسوہ ہوکر اس عالم کو آئے' اللہ کی عطا سے ارادہ ہوا کہ اردوئے معلیٰ کے واسطے سے معلم مکرم کے احوال لکھوں اور اعمال علمی واصلاحی کی مدح کردہ دراصل اس عالم کے ہر آدمی کا کمال اللہ ہی کا کمال عطا ہے ___ اسلام کی ہر صدی کسی سعدیؔ' کسی رومیؔ' کسی سعودیؔ' کسی طوسیؔ سے معمور رہی ہے۔ عالمی سوسائٹی کو علم' ادراک' صلح' رحم لی' ہمدردی کی صدا اسلام ہی کے واسطے سے ملی' الحمدللہ ہمارے ممدوح کے دادا والد' اور والدہ مکرمہ اسلام کے دائمی وسرمدی علم وحلم سے مالامال ہوئے۔ اللہ کے کرم سے علامہ کا سارا گھر کلام الٰہی سے معطر ہے۔ علامہ ممدوح کو رسول اکرم صلی اللہ علیٰ رسولہ وسلم کی دعائے مکرم کا حصہ عطا ہوا' علامہ کی ساری عمر اسی سے ہری ہے' عام مسلم گھر کو اس طرح کا کرم کہاں ملا' اس لئے اک عالَم علامہ ممدوح کی آدھی صدی کی اسلامی' علمی اصلاحی سعی کی مدح سرائی کررہا ہے۔ آٹھ دہے اول سے علامہ کے علم وعمل کا کارواں رواں دواں ہے''۔ (ص:۳۲)

اسی طرح حیدرآباد کے ہی مفتی ابرارمتین بیگ نے اپنے ایک رسالہ ''گلہائے اصلاح'' میں مختلف مضامین کے تحت (۱۱) غیرمنقوط مضامین تحریر کیے۔ مضمون ''راعی عالم الہ علیہ وسلم (ص ۲۱ تا ص ۴۳) سے ایک اقتباس درج ہے:

''ھُدیٰ کا مہر اس طرح طلوع ہوا کہ الی الساء کے لئے طلوع ہی رہا' صلاح واصلاح کی راہ اس طرح کھلی کہ اس کا ہر راہی کام گرو کامران ہوا' گمراہوں کو اس طرح کا ہادی ملا کہ گمراہ لوگ ہی اوروں کے ہادی ہوگئے اور لاعالموں کو اس طرح کا راعی ملا کہ ایک معمولی گلہ کا رراعی کئی ملکوں کا راعی ووالی ہوا''۔ (ص:۴۲)

مزید حیدرآباد ہی میں محافل شعروسخن میں اس صنعت غیرمنقوط پر کافی توجہ کی جارہی ہے چنانچہ اسلامی اسکالر ڈاکٹر سید عبدالمھیمن قادری کامل التفسیر والحدیث نے بھی قرآن مجید کی غیرمنقوط تفسیر کا کام شروع کیا ہے۔ سواطع الالہام (تفسیر قرآن بزبان فارسی) کے بعد شاید پہلی بار اس جانب اردو زبان میں توجہ کی جارہی ہے۔ اردو غیرمنقوط تفسیر قرآن مجید سے سورۃ الفاتحہ کا ترجمہ پیش ہے:

دعاؤں والا سورہ کہ مکہ والے رسول کو عطا ہوا'

حصار کے وسط آرہا ہوں اللہ کی مردود سے کہ وہ ہکالا ہوا ہے'

اللہ کے اسم سے کہ وہ اعلیٰ معطی حد سے سوا رحم والا ہے۔

''مکمل حمد سارے عالموں کے مالک کے لئے ہے کہ وہ اعلیٰ معطی حد سے سوا رحم والا ہے' مالک ہے صلہ کی سحر کا' ہم اللہ ہی کو سارے عالموں کا مالک معلوم کئے اور اللہ ہی سے مدد کا ارادہ کئے ہوئے ہے' ہم کو عمود' دار راہ دکھا' ہم کو وہ لوگوں کی راہ دکھا اس لئے کہ وہ لوگوں کو' وہ لوگوں کو کارکردگی کا صلہ اللہ کا صلہ عطا ہوا' ہم کو وہ لوگوں کی راہ عدم دکھا اس واسطے کہ وہ لوگوں کو کارکردگی کا صلہ اللہ کا کرودھ عطا ہوا' اور گمرہوں کی راہ کو عدم دکھا اور عدم رواں کردے''۔(آمین)

اور سب سے آخر میں راقم الحروف کی تحریر کردہ ایک غیر منقوط نعت شریف پر مضمون ختم کیا جاتا ہے:۔

سر سلوک لاالٰہ درِ رسولؐ
اللہ کے کرم سے ملا ہے درِ رسولؐ
مولیٰ و ماویٰ مہر و عطا ہے درِ رسولؐ
صل علیٰ کمالِ ولا ہے درِ رسولؐ
دارالسلام ہادی عالم کا ہے مکاں
معمورۂ وراء الورا ہے درِ رسولؐ
لوحِ مآل علم و عمل' مصدرِ عُلو
درسِ کلام راہِ ھدیٰ ہے درِ رسولؐ
سر ہوگئے اُس حکمِ الٰہی سے معرکے!
امرِ وحی کا داعی ہوا ہے درِ رسولؐ
احوال اسریٰ طاہر و مسعود و سرمدی
محمود عکس سمر ملا ہے درِ رسولؐ
اک دائرہ ہے محور صد حامل کرم
اصل مدار سعد رہا ہے درِ رسولؐ
گہوارۂ روح و دل کا ہے دارالمطہرہ
ہر درد لا دوا کی دوا ہے درِ رسولؐ
ہمدم مدام' سلسلہ عاصی کی آس کا
حاصل معاد کا کہ صلہ ہے درِ رسولؐ
حرم رسول اکرمؐ و اطہر کے ولولے
اہل مراد محو دعاء ہے درِ رسولؐ
محروموں کی رسائی کا واحد ہے آسرا
حامی' ولی' حصار سدا ہے درِ رسولؐ

O-O-O

بیٹیاں

بیٹیاں زخم ---- سہہ نہیں پاتیں
بیٹیاں درد ---- کہہ نہیں پاتیں
بیٹیاں آنکھ ---- کا ستارا ہیں
بیٹیاں درد ---- میں سہارا ہیں
بیٹیوں کو ---- ہراس مت کرنا
ان کو ہرگز ---- اداس مت کرنا
بیٹیاں نور ---- ہیں نگاہوں کا
بیٹیاں باب---- ہیں پناہوں کا
بیٹیاں عکس ---- اپنی ماؤں کا
بیٹیاں ہیں ---- ثمر دعاؤں کا
بیٹیوں کو ---- سزائیں مت دینا
بیٹیاں چاہتوں---- کی پیاسی ہیں
یہ پرائے چمن ---- کی باسی ہیں

ڈاکٹر معید جاوید
صدر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

اُردو میں سوانح نگاری

تمہید: سوانح نگاری، نثر کی ایک صنف ہے جس کے توسّط سے کسی اہم شخصیت کے داخلی کوائف، خارجی حالات اور اس کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی خدمات کا اعتراف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے پڑھ کر قاری کو زندگی کا مقصد متعیّن کرنے اور اچھی زندگی گزارنے کے لئے تحریک ملتی ہے۔ سوانح نگاری محض کسی کی سوانح کا ذکر ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے ایک عہد اور معاشرے کی تاریخ اور تہذیبی معلومات سے مکمل آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

تعریف: ''سوانح'' عربی لفظ ہے جس کے لفظی معنی واقعات، حادثات، روئداد اور حالات ہیں۔ سانحہ واحد اور سوانح جمع لفظ ہے۔ سوانح نگار، واقعہ نویس، اخبار نویس اور نامہ نگار کو کہا جاتا ہے۔ کسی شخص کے حالاتِ زندگی لکھنے کو بطورِ خاص سوانح نگار کہا جاتا ہے اور کسی شخص کی زندگی کے حالات اور تذکرہ کو ''سوانح عمری'' کہا جاتا ہے انگریزی میں (BIOGRAPHY) کہا جاتا ہے۔

''اصطلاحی اعتبار سے کسی بھی نام اور شخص کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا فن ''سوانح'' کہلاتا ہے''۔ (اُردو اصنافِ ادب، عطاالرحمٰن نوری، رحمانی پبلیکشنز، مالیگاؤں ۲۰۱۶ء۔ص:۷۲)

علاوہ ازیں ڈرائیڈن نے سوانح عمری کی تعریف سب سے پہلے اس طرح بیان کی ہے:

''یہ مخصوص افراد کی زندگیوں کی تاریخ ہے''

(اُردو میں سوانح نگاری کا ارتقاء۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ۔ص:۲۳)

اس طرح جانسن کا خیال ہے کہ:

''سوانح عمری ایسی بیانیہ تحریر ہے جسے بڑی رضامندی کے ساتھ پڑھا جائے اور بڑی آسانی کے ساتھ زندگی کے مقاصد تک جس کی رسائی ہو۔''

(حالی کی سوانح نگاری، ملک راشد فیصل، ص:۱۲۔۲۰۰۷ء)

ان تمام تعریفات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سوانح عمری دراصل مخصوص شخصیات کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جس میں ان کے اہم اور وقیع کارناموں کا ذکر ہوتا ہے۔

موضوع اور غرض و غایت: سوانح نگاری کا موضوع شخص، شخصیت یا انسان ہے۔ کسی عظیم المرتبت شخصیت کی سوانح لکھنے کی غرض ''افادی'' ہوتی ہے کہ اس سے دوسروں کو فائدہ حاصل ہو۔ کبھی اخلاقی تقاضے کے تحت سوانح لکھی جاتی ہے کبھی اصلاحِ

قوم کے جذبے سے سوانح تحریر کی جاتی ہے، کبھی کسی شخصیت سے عقیدت وارادت کے باعث سوانح لکھی جاتی ہے، کبھی تجارت کی غرض سے بھی سوانح لکھی گئی، کبھی حکومتِ وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بھی سوانح لکھی جاتی ہے اور کبھی قومی وملّی یا تبلیغی جذبے کی خاطر بھی سوانح حیات لکھی جاتی ہے۔

سوانح میں متعلقہ شخصیت یا ممدوح کی زندگی کے حالات، واقعات، سانحات، خدمات ودیگر جزئیات جیسے خاندانی حالات، آباء و اجداد کا ذکر، پیدائش، ابتدائی تعلیم، تربیت و پرداخت، اعلیٰ تعلیم، اساتذہ، شادی بیاہ، اولاد، ملازمت، اکتسابِ فیض کے مرحلے، تخصیص کا میدان، کارنامے، اعزازات، کتابیں، شاگرد اور رحلت کا ذکر ملتا ہے۔ گویا پیدائش سے وفات تک مکمل حالات کا مفصّل بیان کئے جاتے ہیں۔

آغاز وارتقاء :

سوانح عمری ایسی نثری صنف ہے جس کے اجزاء دیگر اصناف جیسے تاریخ نگاری، تذکرہ نگاری اور سیرت نگاری سے مماثلت اور ان اصناف سے کسی حد تک مختلف ہوکر یہ ایک مستقل صنفِ ادب قرار پائی۔ سوانح نگاری کا تعلق تاریخ سے بھی ہے اس لئے کہ ''سوانح نگاری'' بھی کسی نہ کسی عظیم المرتبت یا اہم شخصیت کی ''تاریخ'' ہی ہوتی ہے اسی لئے ممتاز ادیب، محقق ونقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''سوانح نگاری کا تعلق تاریخ کے شعور اور ماضی کے احساس سے ہے۔ جن تبدیلیوں میں ماضی کو تحریری اعتبار سے مردہ سمجھا جاتا ہے اور جن میں افراد کو تاریخ پر براہِ راست اثر انداز نہیں فرض کیا جاتا ان میں سوانح نگاری بھی منقود ہوتی ہے۔ مغرب میں روما کی اور مشرق میں اسلامی تہذیبیں اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں سوانح نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ ہندوستان میں ہند اسلامی تہذیب کے زیر اثر تاریخ نگاری اور سوانح نگاری دونوں کو فروغ ہُوا۔ مسلمانوں نے ایسی تاریخیں بھی لکھیں جن میں خاص واقعات کو کسی ایک مرکزی شخصیت کے تناظر میں بیان کیا گیا تھا۔ اس طرح تاریخ اور سوانح حیات میں زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔''

(اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ۔ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ ۔ ص:۱۴)

یہ ایک حقیقت ہے کہ سوانح نگاری میں تاریخ ضرور بیان کی جاتی ہے۔

''سوانح نگاری'' میں ''تذکرہ نگاری'' کے اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں۔ بعض تذکرے جو اولین اور بہت مشہور و معروف ہیں جیسے نکات الشعراء از میر تقی میرؔ، گلشن گفتار از حمید اورنگ آبادی، تحفۃ الشعراء از مرزا فضل بیگ قاقشال، تذکرہ ریختہ گویان از سید فتح علی حسینی، مخزنِ نکات از محمد قیام الدین، ریاض حسنی یا تذکرہ قنوت از خواجہ عنایت اللہ فنوت، چمنستانِ شعراء از لچھمی نرائن شفیق، طبقات الشعراء از قدرت اللہ شوقؔ، تذکرہ شعراء اُردو از میر حسنؔ دہلوی، تذکرہ شورش یار موزالشعراء از غلام حسین شورشؔ اور گلشنِ سخن از میرزا کاظم مردان علی خان مبتلاؔ وغیرہ ہیں۔ ان سب میں سوانحی عناصر ملتے ہیں، علاوہ ازیں سیرت نگاری میں بھی سوانحی اجزاء ملتے ہیں، جیسے اُردو میں سیرت النبیؐ از علامہ شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، سیرت

الرَّسولؐ از مرزا محمد حیرت' سیرت المحمود از عزیز مرزا' سیرتِ فریدیہ از سرسید احمد خان' سیرت نظامی از سید یٰسین علی نظامی اور سیرت ائمہ اربعہ از سید رئیس احمد جعفری وغیرہ ہیں۔ غرض ان سب میں سوانحی اجزاء ملتے ہیں۔ انہیں اصناف سے الگ ہوتے اور صیقل ہوتے سوانح نگاری کی صنف وجود میں آئی۔

سوانح نگاری دیگر اصناف کی طرح عربی اور فارسی سے اُردو میں رائج ہوئی۔ دیگر زبانوں کی طرح اُردو میں بھی اس موضوع پر وقیع مواد ملتا ہے۔

سوانح نگاری کی قسمیں:

بنیادی طور پر سوانح نگاری کی درجِ ذیل تین قسمیں ملتی ہیں:

۱۔ طبع زاد سوانح

۲۔ طنزیہ و مزاحیہ سوانح

۳۔ ترجمہ شدہ سوانحی کتابیں (خصوصاً عربی' فارسی' انگریزی' فرانسیسی' جرمنی وغیرہ زبانوں سے اردو میں تراجم)

سوانح نگاری کی شرائط :

سوانح نگاری نہایت ذمہ داری کا کام ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سوانح نگار کے ممدوح سے تعلقات رہے ہوں۔ مختلف اغراض کے پیشِ نظر تعلقات کے بغیر بھی سوانح حیات تحریر کی جاتی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ انگریزی میں اپنے ممدوح کے محاسن کا جہاں ذکر ہوتا ہے وہیں انصاف کے پیشِ نظر ''معائب'' کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا شخصیت کے مثبت اور منفی ہر دو پہلوؤں کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اُردو میں اکثر و بیشتر سوانح نگار اسلام سے وابستگی اور اس کی تعلیمات کے پیشِ نظر اپنے ممدوح کے صرف محاسن کے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں اس لئے معائب کا ذکر عموماً سوانح حیات میں نہیں ملتا۔

سوانح نگاری میں موضوع' مواد اور اندازِ بیان کی بہت اہمیت ہوتی ہے بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں دیانت داری' ترتیب وار جائزہ' محاکمہ' جزئیات' تاریخی ٹھوس صداقت' سن واری درستگی' حقیقت نگاری' حفظِ مراتب کا خیال' شایانِ شان انداز و الفاظ' مناسب لفظیات و تعبیرات' شگفتہ و دلکش اُسلوب اور اپنے ممدوح کے اصل رجحان و نظریات پر خصوصی توجہ کے ساتھ ساتھ معتبر اور مستند مواد شامل کیا جائے۔ ہر صورت میں منفی پہلو سے اجتناب کرے اور ممدوح کے حالات و واقعات کے سلسلہ میں مبالغہ آرائی' تعصب' تحفظ ذہنی' تفاخر' غلط بیانی یا بے جا تعریف سے بچے۔ حقائق سے اعراض نہ کرے' جانب داری یا طرف داری سے گریز کرے بلکہ معروضی انداز قائم رکھے۔

اُردو میں سوانحی ادب پر موجود اہم مواد:

اُردو میں سوانحی ادب پر خاصا لکھا گیا ہے جیسے سیرت فریدیہ' آثار الصنادید (تذکرۂ دہلی و اہلِ دہلی) مؤلفہ سرسید احمد خان۔ حیاتِ سعدی' یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید مؤلفہ مولانا الطاف حسین حالؔی' سوانح مولانا رومؒ' الفاروق' الغزالی' سیرت النبیؐ' سیرت النعمان اور ڈپٹی نذیر احمد مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی۔ جنید بغدادی' لارڈ بیکن' ابوبکر شبلی' سکینہ بنتِ حسین' خواجہ معین الدین

چشتی، سوانح عمری رستم تہمتن اور عائشہ صدیقہ از عبدالحلیم شرؔر۔ حیاتِ النذیر از افتخار عالم، حیاتِ دبیرؔ از فضل حسین ثابت، غلام الثقلین اور ابوالفضل علامیؔ، تواریخ عجیبہ (سیرت سید احمد شہید) از تھانیسری، سیرت المحمود از محمد عزیرؔ مرزا، حیات زیب النساء از منشی محمد دین خلیقؔ، مُلا دو پیازہ، حیاتِ ٹوڈرمل، مہاتما بدھ اور شمس تبریز از منشی محمد دین فوقؔ۔ حیاتِ خسرؔو از محمد سعید مارہروی، نور جہاں بیگم، زیب النساء بیگم، فردوسی، ارسطو، افلاطون از مرزا محمد حیرتؔ۔ ابراہکہ از عبدالرزاق کانپوری۔ ملکہ وکٹوریہ از ذکاء اللہ۔ سیرت الفاروق اور حیات صلاح الدین از مولوی سراج الدین احمد۔ سیرت الصدیق از حافظ عبدالرحمٰن اور رحمۃ للعالمین از محمد سلیمان منصور پوری وغیرہ کتابیں مشہور و معروف ہیں جن سے اُردو کے سوانح ادب میں شاندار اضافہ ہوا ہے۔

علاوہ ازیں اس موضوع پر چند خالص تحقیقی کتابیں بھی ملتی ہیں جیسے فن سوانح نگاری از ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہیںؔ۔ اُردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء از الطاف فاطمہ، اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء ۱۹۱۴ء تا ۱۹۷۵ء از ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، بہار میں اُردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء از ڈاکٹر عبدالواسع اور حالیؔ کی سوانح نگاری از ملک راشد فیصل ہیں۔ ان ساری کتابوں میں سوانح نگاری کے فن اور موضوع کا تحقیقی انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔

اختتام:

اُردو میں سوانحی ادب پر جتنی کتابیں دستیاب ہیں ان کے مطالعہ سے نہ صرف فنِ سوانح نگاری پر اس کے سوانح نگاروں کی دسترس کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کتابوں سے سوانح نگاروں کے زاویۂ نگاہ، رجحانات، میلانات، نظریات، اندازِ فکر و نظر، ادبیت، حقیقت نگاری اور اظہار و تعبیر کی دیگر خصوصیات کا بھی بھرپور اظہار ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ سوانح نگاروں کے ممدوحین کی اعلیٰ خدمات اور کارہائے گراں مایہ کا بھی پتہ چلتا ہے جو اپنے قارئین کو یہ سبق دیتے ہیں کہ ''تم بھی ایسے بنو'' ان تمام اُمور سے اردو ادب کی اس صنف کے وقیع سرمایہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو ادب میں بطورِ خاص آزادی کے بعد لکھی جانے والی سوانح عمریوں پر بھی تحقیقی کام کیا جائے اور ہر علاقہ میں اس صنفِ ادب پر جتنا کام ہُوا ہے اسے منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ اس روایت کو استحکام ملے اور اس کی توسیع کے امکانات روشن رہیں۔

ماخذات و مصادر:

۱۔ فن سوانح نگاری
ڈاکٹر امیر اللہ خان شاہیںؔ، طاہر بک ایجنسی، دہلی ۱۹۷۳ء
۲۔ بہار میں اُردو سوانح نگاری کا آغاز و ارتقاء، ڈاکٹر عبدالواسع، ۱۹۷۹ء
۳۔ اُردو ادب میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء، الطاف فاطمہ، اعتقاد پبلشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۷۲ء
۴۔ اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء (۱۹۱۴ تا ۱۹۷۵ء)
ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، رونق پبلشنگ ہاوس، دہلی ۱۹۸۴ء
۵۔ حالیؔ کی سوانح نگاری، ملک راشد فیصل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی ۲۰۰۷ء

O-O-O

مجید صدیقی
حیدرآباد

حیدرآباد دکن کے ممتاز شاعر ''سکندر علی وجدؔ'' ایک تجزیہ
(فکر وفن کے آئینہ میں)

سکندر علی وجدؔ حیدرآباد کے مایہ ناز شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں اوراس وقت ان کے دور میں انہیں اُردو ادبی محفلوں میں کثرت سے سنا جاتا تھا اور وہ سامعین اورادب کے شائقین سے داد وتحسین پاتے تھے۔

وجدؔ بنیادی طور پر ''نظم'' کے شاعر ہیں جنہوں نے اُردو ادب میں نظم کو بام عروج تک پہنچایا ہے۔ان کی نظمیں پراثر اوردل کو چھو لینے والی ہوا کرتی تھیں جنہیں اردو ادب کا قاری پسندیدگی اورشوق سے سنا کرتا تھا۔

وجدؔ کوالفاظ کے تانے بانے کو جوڑکر ایک خوبصورت چمن یا پھرمحل بنانے میں مہارت حاصل ہے۔ان کے پاس الفاظ کا کثیر ذخیرہ تھا جس کی بدولت وہ بہت ہی خوبصورت اوردلپذیر نظمیں لکھا کرتے تھے۔وجدؔ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں فنون لطیفہ، آرٹ موسیقی اورنغموں سے بہت دلچسپی تھی اوراس میں انہیں دخل تھا۔وہ ملک کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اورپھر بعد میں وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی کے سامنے بھی اپنی نظمیں ترنم میں سنا کر ایک سماں باندھ دیا کرتے تھے اوران کے دومجموعہ کلام کی رسم اجرائی انہی کے ہاتھوں سے ہوئی تھی۔سکندر علی وجدؔ ۲۲/جنوری ۱۹۱۲ء کو بیجاپور ضلع اورنگ آباد (مہاراشٹرا) میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی جہاں 1929ء میں شاعری کا آغاز ہوا۔وہ حیدرآباد کے ابتدائی عثمانین میں شمار کئے جاتے تھے جہاں عثمانیہ یونیورسٹی سے انہوں نے 1935ء میں بی اے پاس کیا اور 1937ء میں حیدرآباد سیول سرویس کا امتحان کامیاب کیا اوراسی سال منصفی سے ملازمت شروع کی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے اس وقت کے ادبی ماحول نے ان کی شاعری کو جلا بخشی اوروہ باقاعدہ اشعار کہنے لگے۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستان کے صوبوں کی تنظیم جدید کے موقع پر وہ مہاراشٹرا منتقل ہوگئے۔جہاں ۱۹۶۴ء میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے سے قبل از وقت پنشن لے لی۔انہیں ۱۹۷۰ء میں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔وہ ۱۹۷۲ء تک پارلیمنٹ (راجیہ سبھا) کے ممبر رہے۔۱۹۷۲ء سے مولانا آزاد تعلیمی سوسائٹی اورنگ آباد کے نائب صدر، انجمن اسلام بمبئی کے ٹرسٹی اورانجمن ترقی اُردو ہند کے حیاتی رکن ہے۔۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء تک مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی کے نائب صدر رہے۔۱۹۸۰ء میں اسی اکیڈیمی کے دوسری بار رکن نامزد ہوئے۔۱۹۸۱ء میں حکومت ہند کے ترقی اردو بورڈ کے وائس چیرمین اورمرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ

آباد (مہاراشٹرا) کے سنیٹ کے رکن نامزد ہوئے۔

وجؔد کے شعری مجموعے ہیں:

۱۔ لہوترنگ	۱۹۴۴ء
۲۔آفتاب تارہ	۱۹۵۲ء
۳۔اوراق مصور	۱۹۶۲ء
۴۔بیاض مریم	۱۹۷۵ء
۵۔انتخاب (پانچواں ایڈیشن)	۱۹۷۷ء

☆ اُتر پردیش اُردو اکیڈیمی لکھنو سے بیاض مریم پر پہلا انعام 3ہزارروپیہ

☆ غالب انسٹی ٹیوٹ نیودہلی کا پہلا ایوارڈ پانچ ہزارروپیہ

۱۹۸۱ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ترقی اردو بورڈ کے وائس چیرمین مقرر ہوئے اوراسی عہدے پر فائز رہتے ہوئے ۱۶رمئی ۱۹۸۲ء بمقام اورنگ آباد اس دارفانی سے کوچ کیا۔

سکندر علی وجؔد کے اشعار کا مجموعہ (کلیات وجد) ان کی وفات کے بعدان کی شریک حیات محترمہ زبیدہ خاتون سکندرعلی وجؔد نے جولائی ۱۹۸۸ء میں، مہاراشٹرا اُردو اکیڈیمی کے تعاون سے ''جمال اجنتا جلال ہمالہ'' کے نام سے اورنگ آباد سے شائع کروایا جس میں وجؔد کی تمام مقبول نظمیں اورکچھ غزلیں بھی شامل ہیں۔اس مجموعہ کلام کو شائع کرنے کے سلسلہ میں جنہوں نے تعاون اورکام کی نگرانی کی ان میں ڈاکٹر مظہرمحی الدین پرنسپل مولانا آزاد کالج ،ڈاکٹرصفی الدین صدیقی ،جناب میر ہاشم اورجناب عبدالمجید بیدارصاحب جواس وقت مولانا آزاد کالج کے لکچرار تھے،اِن سب حضرات کے تعاون سے وجؔد کا یہ کلیات معرض وجود میں آیا۔اس پر ہندوستان کے مشہورآرٹسٹ یم ایف حسین کے آرٹ کا نمونہ ہے جوایک خاتون کی تصویر ہے۔یم ایف حسین سے وجؔد کے دوستانہ تعلقات تھےاوروہ وجدکی شاعری کے مداح بھی تھے۔جناب محبوب حسین جگر (سیاست) کے تعاون کا محترمہ وجؔد نے شکریہ ادا کیا ہے۔اس مجموعہ کلام کا ایک نسخہ راقم الحروف کی گذارش پر جناب عبدالمجید بیدارؔ صاحب نے ازراہ مہربانی بغرض مطالعہ مجھے عنایت فرمایا ہے جن کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔

سکندرعلی وجؔد کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ اورسلیس ہے، انہوں نے موضوع کی ہمہ رنگینی اور عصرحاضر کے تقاضے کوملحوظ رکھتے ہوئے بھی نظم کے روایتی آہنگ کواپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایت کو ہمیشہ برقراررکھااورکبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اُردوادب میں خصوص کرنظم کے تعلق سے وجؔدصاحب کی دونظمیں شہرہ آفاق ہیں۔ایک ہے''عبدالرزاق لاری'' اوردوسری''مزدوروں کا پیغام طلباء جامعہ عثمانیہ کے نام''۔ اسی وجہ سے اُردودنیا میں رہتی دنیا تک اُن کا نام رہے گا۔ وجؔد کا سارا کلام اوران کی یہ دونظمیں ایک طرف کہی جاسکتی ہیں۔یہ دونظمیں، میڈل اسکول، ہائی اسکول اورڈگری کے نصابوں میں بھی اسی وجہ سے شامل کی گئیں ہیں۔

وجدصاحب اپنے پڑھنے والوں کے دلوں اپنی شاعری کا جادوکردیتے ہیں۔ان دونظموں میں ان کا فن شاعری عروج پردکھائی دیتاہے یوں تووجد کی سب ہی

نظموں میں تاثیر، سوز وگداز، معنویت اور ایک فرحت بخش توانائی اور غنائیت محسوس ہوتی ہے اور قاری ان کے الفاظ کی بندش اور نشست و برخاست کو دیکھ کر عش عش کر اُٹھتا ہے۔

دراصل وہ فطرتاً شاعر واقع ہوئے تھے، اپنی کم عمری و طالب علمی کے زمانے سے ہی شاعری کی طرف توجہ کر چکے تھے اور پھر بعد میں انہیں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے ادبی ماحول میں اُن شاعری اور پروان چڑھی جہاں بہت سے ان کے سینئر دوست واحباب سب ہی ادبی تحریکوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ وجدؔ کو منظر کشی میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ جب کسی کا خاکہ کھینچنا ہو تو مناسب الفاظ اور متعلقہ فرد یا منظر کے بارے میں معلومات کا ایک دریا بہا دیا کرتے تھے اور اپنے طرز نگارش سے ماحول کو موقع کی نزاکت و مناسبت سے ملول یا رنگین بنا دیا کرتے تھے۔ وہ محاکات نگاری کے بھی ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ دراصل وہ ایک حساس انسان تھے اور ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ اور اعلیٰ درجہ کے ذہین اور قابل شخص تھے۔ بقول محترمہ زبیدہ خاتون سکندر علی وجدؔ جو ہر ایک کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے، تب ہی تو ان کے قلم سے دردومند دل کی کئی تحریریں وجود میں آئی ہیں جن کے عنوانات ہیں ''طلباء جامعہ عثمانیہ کے نام''، ''عابد روڈ کی بھکارن''، ''ایک نرس، فرزند جامعہ عثمانیہ''، ''جامعہ عثمانیہ کی چاندنی''، ''علی ساگر (نظام آباد کے قریب)''، ''چار مینار''، ''اقبال''، ''حیدرآبادی نوجوان سے خطاب''، ''حیدرآبادی طالب علم سے خطاب''، ''کالج کا ترانہ''، ''شیخ چاند (ان کے دوست)''، ''حیدرآباد کی صلح''، ''عاشق شہنشاہ''، ''چاند بی بی''، ''جگنو''، ''مزار عالمگیر''، ''وداع اقبال''، ''جیالے چراغ''، ''غریب الوطنی''، ''یادِ چکبست''، ''مخدوم کا خیال''، ''اشفاق کے نام''، ''وقت کی آواز''، ''تاج محل''، ''والد مرحوم''، ''مہاراجہ کشن پرشاد''، ''اورنگ آباد دکن''، ''حضرت زربخش''، ''بہادر یار جنگ کے نام''، ''محمد علی''، ''حضرت شاہ خاموش حیدرآبادی''، ''سچی باتیں''، ''یادِ نشاط''، ''مرقع احباب''، ''چلا گیا''، ''ڈاکٹر حامد علی حیدرآبادی''، ''نظیر اکبرآبادی''، ''صبح نو''، ''جوہری بم کی تباہ کاری''، ''ایلورا''، ''اجنتا''، ''امید''، ''پیام اقبال''، ''جمنا کی فریاد''، ''کاروان زندگی''، ''نقش ناتمام''، ''رقاصہ''، ''جواہر لال نہرو''، ''عالم آشوب''، ''طیّبہ''، ''نذر مہدی نواز جنگ''، ''اے دوست''، ''حرف تمنا''، ''نذر وطن''، ''حیدرآباد''، ''حسین کی تصویریں''، ''اندرا گاندھی''، ''دولت بیدار''، ''امن کا پھول''، ''پروین سلطانہ (مغنیہ)''، ''مہاتما'' وغیرہ۔

اور ان کے علاوہ دیگر بیشتر موضوعات پر انہوں نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ ''جمال اجنتا جلال ہمالہ'' مجموعہ کلام میں وجد کی ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۲ء تک کی جملہ شاعری کی اساس کا احاطہ کیا گیا ہے۔

وجدؔ صاحب کی غزلیں بھی کسی شاہکار سے کم نہیں۔ ان کی غزلوں کو ہندوستان کے کسی بھی بڑے اُردو کے نامور شاعر کی غزلوں کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ جس طرح ان کی نظموں میں ہمیں بانکپن، سوز اور جذبات کی گہرائی و تیرائی جلتی ہے وہیں ہمیں ان کی غزلیں ہمارے

کلاسیکی دور کی غزلوں اور روایتی شان کا مظہر ہیں۔

ان کی غزلوں میں ہمیں احساس کی فراوائی اور جدت طرازی کے کئی روشن پہلو دیکھنے کو ملتے ہیں جو بہت کم شعراء کے کلام میں نظر آتی ہے۔سکندر علی وجد دکن کے عظیم شعراء کی فہرست میں شامل ہیں جن کا کلام نہ صرف ہندو پاک بلکہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔

جب وہ علی ساگر جو ایک مصنوعی جھیل اور چھوٹا سا ذخیرۂ آب ہے جو نظام آباد سے 8 کیلو میٹر دور ایک پرفضا مقام پر واقع ہے جس سے متصل ایک باغیچہ بھی ہے جو ایک تفریحی مقام ہے' اُس کی منظر کشی کرتے ہیں تو لگتا ہے ہم علی ساگر کے سامنے کھڑے ہیں اور لہروں کی روانی سے محظوظ ہو رہے ہیں ۔وہ اپنے موزوں الفاظ کی مدد سے مناظر کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے ۔ وجدؔ کا کلام کسی بھی عظیم اُردو شاعر کے مقابل رکھا جا سکتا ہے جو کسی بھی طرح معنی' موضوع' بیان اور شعری لوازمات سے پرہوا کرتا ہے اور کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

وجدؔ ایک حب وطن شاعر تھے' ان کی نظموں میں ہمیں جا بجا وطن سے محبت کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جیسے نظم عبدالرزاق لاری' حیدرآبادی نوجوان کے نام' چار مینار' جواہر لال نہرو' محترمہ اندرا گاندھی کے بارے میں نظمیں وغیرہ ان کی وطن پرستی کی مثالیں ہیں۔

ذیل میں ان کی چند مشہور شہرہ آفاق نظموں سے مثالیں دی جاتی ہیں تاکہ ان کے شاعرانہ خیالات و رجحانات سے واقفیت حاصل ہو سکے۔ اس کے ساتھ چند غزلوں سے بھی اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

عبدالرزاق لاری:

عبدالرزاق لاریؔ ابوالحسن قطب شاہ کا نہایت جاں نثار و جاں باز جرنیل تھا۔ ۱۶۵۷ء میں عالمگیری لشکر نے گولکنڈہ قلعہ کا محاصرہ کیا۔انعام واکرام کی لالچ اور جان و مال کی تباہی کے ڈر سے بڑے بڑے قطب شاہی سردار، مغلوں سے جا ملے لیکن لاری کی حمیت نے اپنے آقا کو مصیبت میں چھوڑنا گوارا نہ کیا۔شہنشاہی لشکر کی جان توڑ کوشش اور قطب شاہی سرداروں کی غداری کے باوجود محض لاریؔ کی حسن تدبیر کی بدولت کامل آٹھ مہینے تک قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ایک رات نمک حرام عبداللہ پٹنی نے دشمن سے سازش کر کے قلعہ کے دروازے کھول دیئے ۔لاری یہ خبر سنتے ہی تیغ و سپر لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر دیوانہ وار عنیم پر جا گرا ۔سینکڑوں حملہ آوروں کو موت کے گھاٹ اتارنے وہ خود ستر زخم کھا کر زمین پر گر پڑا۔شہنشاہ اورنگ زیب کو جب اس کی غیر معمولی شجاعت کا حال معلوم ہوا تو اس نے علاج کے لئے طبیب خاص کو مقرر کیا اور کہا ''اگر قلعے میں ایسا ایک اور وفادار ہوتا تو فتح ناممکن تھی''۔لاری کے اس کارنامہ کو وجدؔ نے پردہ ہٹا کر لاری کے کردار کو وفا شعوری اور حبُّ الوطنی کی جیتی جاگتی تصویر بنا کر اُس کے کردار کو زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

باقی کوئی سلطان کا ہوا خوار نہیں ہے
کون ہے جو انجام سے آگاہ نہیں ہے
دل کس کا اسیر کششِ جاہ نہیں ہے
ایک تو ہی اکیلا ہے جو گمراہ نہیں ہے

غصّے میں رخ تیغ دو دم چوم رہا ہے
خادِم در آقا پہ کھڑا جھوم رہا ہے
یہ ہاتھ ہے یا دست اجل طالب جاں ہے
قبضے میں تیرے تیغ ہے یا برق تپاں ہے
حلیو میں ترا عزت گلنار ہوا ہے
ہرعضو بدن جسم سے بیکار ہوا ہے
پیانے وفا تونے مصیبت میں نہ توڑا
جب تک رہی طاقت درآقا کو نہ چھوڑا
مشکل میں گوارا نہ کیا غیر کا احسان
رد کردیا یہ کہکے شہنشاہ کا فرمان
مفتوح یہ اختر کی امانت ہیں دل وجان
میں ملک ہوں مالک کی یہی ہے مرا ایماں
روکے سے میرا جوشِ وفا رک نہیں سکتا
گردن میری کٹ سکتی ہے سر جھک نہیں سکتا
شمشیر دکن تونے عجب دھاک بٹھادی
دشمن کو شب گور کی تصویر دکھادی
اے مرد خدا قدر و وفا توے بڑھادی
قرباں تیرے، مالک کے لئے جان لڑادی
جب تک نظام یہ سحر و شام رہے گا
تاریخ دلیراں میں تیرا نام رہے گا

اس طرح وجدؔ نے عبدالرزاق لاریؔ کی دلیری کی داستان پر سے پردہ ہٹا کر اس کے کردار کو امر بنادیا۔

''مزدوروں کا پیغام (طلبہ جامعہ عثمانیہ کے نام):

سکندر علی وجدؔ نے اپنی اس شہر آفاق نظم میں اُن مزدوروں کے احساسات کی ترجمانی کی ہے جنہوں نے جامعہ عثمانیہ (آرٹس کالج) کی منفرد وانوکھی عمارت تعمیر کی تھی۔

جامعہ عثمانیہ کا سنگ بنیاد حیدرآباد دکن کے آصف جاہی حکمراں نواب میر عثمان علی خان نے 1918ء میں رکھا تھا۔ اس کی تعمیر کے لئے ایران وافغانستان وترکی سے انجنیئر س بلائے گئے تھے جن کے ساتھ ہمارے حیدرآباد کے انجنیئر س اور ماہر فن سنگ تراش و مزدور دن و رات کام کیا کرتے تھے۔ والئ دکن نے اس جامعہ میں اُردو زبان کو تمام عصری علوم کی تعلیم کے لئے منتخب کرکے ایک نیا اور انوکھا تجربہ کیا تھا جو کامیاب رہا۔

اس عمارت کا ڈیزائن حیدرآباد کے ہندو مسلم اتحاد جسے گنگا جمنی تہذیب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اُسی پر مبنی ہے جو ساری دنیا میں تعلیم اور عمارات کے لحاظ سے منفرد ہے:

''نونہالانِ چمن'' اہل ہنر جاتے ہیں
جوش زن قلب میں ہے شوق سفر جاتے ہیں
صورت خاک رہے مثل شرر جاتے ہیں
یہ بھی معلوم نہیں کہ کدھر جاتے ہیں
لو چلا قافلہ کوہکن خانہ بدوش
کل سے ہوجائیں گے شیشوں کی صدائیں خاموش
ہم کو آجر سے شکایت ہے نہ قسمت سے گلا
ملہم غیب سے ہر روز یہی درس ملا
عشق کی سان پہ ہوتی ہے طبیعت کی جلا
ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اُس کا صلہ
دل سے نکلا ہے پیغام جگر داروں کا

عزم سرشار ہی خلاق ہے شہکاروں کا
جوش و اخلاص سے کی کوششِ پیہم ہم نے
نظمِ کہسار کیا درہم و برہم ہم نے
کوہِ غم ٹوٹ پڑے پر نہ کیا غم ہم نے
کردیا قوم کا ایک خواب مجسّم ہم نے
ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

مزدوروں کا یہ المیہ ہے کہ وہ ہرایک کے لئے گھر بناتے ہیں، لیکن خود انہیں اپنے لئے گھر نہیں ہوتا۔ بے شک شاعر آرٹسٹ اور فوٹوگرافر کا زاویہ نگاہ (فوکس) عام آدمی کے زاویہ نگاہ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ یہ بات وجدؔ نے اپنی اس بے مثال نظم سے ثابت کردی ہے۔ انہوں نے مزدوروں کے جذبات واحساسات کو اپنی شاعری کے ذریعہ زبان دیدی ہے۔

وجدؔ نے مہاراجہ کشن پرشاد وزیراعظم ریاست حیدرآباد کی علم دوستی، ادب پروری اور فیاضی کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی جس کے چند اشعار ہیں:

مجھ کو جو کچھ ہے سلیقہ سخن آرائی کا
یہ نتیجہ ہے تیری حوصلہ افزائی کا
کیوں نہ شہرہ ہو تیرے خلق و روا داری کا
فیض دولت ہے آصفؔ سابع کی وفاداری کا
یہ تیرا حسنِ عطا دل کو بہت بھاتا ہے
کرکے سائل پہ کرم آپ ہی تڑپاتا ہے
علم وحکمت کی یہ کثرت یہ فقیرانہ مزاج
اہل نیشن تجھے دیتے ہیں عقیدت کا خراج

وجدؔ ''میرا مسلک'' کے نام سے ایک رُباعی لکھتے ہیں:

میں نرم عشرتِ احباب کو برہم نہیں کرتا
کبھی اشکوں سے اپنے اُن کا دامن نم نہیں کرتا
یہ ایک دستور ہے میرا کہ اپنے قدردانوں کو
شریک عیش کرتا ہوں شریک غم نہیں کرتا

ایک جگہ ''نہ کر'' کے عنوان سے ایک نظم انہوں نے لکھی ہے جس میں علامہ اقبالؔ اور امجدؔ حیدرآبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔

بلا سے جان چلی جائے عرض حال نہ کر
بجز خدا کے، درِ غیر پر سوال نہ کر
تیری حیات کا حسنِ عمل ہے پیمانہ
فقط شمار شب و روز ماہ و سال نہ کر
دلیل بے ہنری ہے شکایتِ دنیا
کسی سے شکوہ ناقدریٔ کمال نہ کر

علی ساگر جو نظام آباد سے 8 کیلومیٹر ایک مصنوعی جھیل ہے اور اس سے اور اس سے متصل ایک باغیچہ بھی ہے۔ اس کا بیان کرتے ہیں:

علی ساگر میں بحر زندگانی موجزن دیکھا
تمنا کا گلستاں آرزوؤں کا چمن دیکھا
زمیں کے چپے چپے کو فلک پر خندہ زن دیکھا
دل شاعر تڑپ جاتا ہے ایسا بانکپن دیکھا
یہ پانی یہ موجیں مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں
گھٹائیں تلملاتی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں
تیری خاک چمن کو میں نے پلکوں سے اٹھایا ہے
گل وریحاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے
تیری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے

تیری تعریف کا نغمہ تجھے پہروں سنایا ہے
میری آواز کی تجھ کو رہے گی آرزو برسوں
مجھے بھی اے علی ساگر کرے گا یاد تو برسوں

ایک جگہ مخدوم کا خیال عنوان سے:

اہل سخن، سخن میں کیا رکھا ہے
اس کے کھوکھلے فکر و فن میں کیا رکھا ہے
مزدور کے چہرے کی شفق تو دیکھو
بیکار گل و سُمن میں کیا رکھا ہے

وجدؔ ایک جگہ ترانہ دکن میں اسطرح اپنی محبت کو ظاہر کرتے ہیں ۔ اس نظم میں ڈاکٹر علامہ اقبال کا رنگ چھلکتا دکھائی دیتا ہے:

ہندو پجاریوں نے جس کو گلے لگایا
رعنائیوں نے جس کی گوتم کا دل لبھایا
حصے میں جس کے فیضِ بندہ نواز آیا
اُردو زباں کو جس نے جینے کا گُر سکھایا

کبھی والی دکن عثمان علی خان'' آصف'' بھی تخلص استعمال کرتے تھے:

اسلاف کی امانت اخلاص کی نشانی
گنجینۂ اخوت، دریائے شادمانی
صدق وصفا کا مسکن، اُلفت کی راجدھانی
جس میں دلوں پر آصف کرتے ہیں حکمرانی

ایک جگہ حیدرآبادی طالب علم سے خطاب میں کہتے ہیں:

تقلید و خرافات روایت سے نکل جا
سیماب صفت جلد ہر ایک سانچے میں ڈھل جا
بدلی ہے زمانے کی فضا تو بھی بدل جا
مہلک ہے یہاں لغزش پا دیکھ سنبھل جا
ٹھوکر جو لگے راہ میں خاموش نہ چل دے
گر امن کا طالب ہے تو فتنوں کو کُچل دے
نصرت کا صلہ صرف بہادر کے لئے ہے
آرائش ساحل تو شناور کے لئے ہے

ایک جگہ وجدؔ چاندبی بی'' کے نام سے اپنی نظم ''چاندبی بی'' میں چاند بی بی کی دلیری، شجاعت و حب الوطنی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مغل شہنشاہ اکبر کی فوجوں نے جب احمد نگر کا محاصرہ کرلیا تب اُس نے بے جگری سہ مقابلہ کیا:

شہرہ تیرے جمال کا نزدیک و دور تھا
دل نورِ حق سے عزتِ صد کوہِ طور تھا
رخ پر جلال عصمتِ مریم کا نور تھا
بازو میں زور بازوئے حیدر ضرور تھا
گردن پہ بار عمرِ گریزاں نہیں لیا
دستِ عدو سے درد کا درماں نہیں لیا
ہمراہ رختِ حسرت و ارماں نہیں لیا
جنسِ بقا کو تو نے کچھ ارزاں نہیں لیا
سرشار ہوکے توڑگئی جامِ زندگی
لوحِ جہاں پہ چھوڑگئی نامِ زندگی

سب سے پہلے دعا میں وجدؔ کہتے ہیں:

سر تیرے آستاں پہ جھکے پھر نہ اٹھ سکے
اتنا بلند جذبۂ ذوقِ نماز دے

درویش کا سوال پہ زور زر نہیں
فکرِ فلک شگاف و دلِ بے نیاز دے

ایک جگہ حضرت سید شاہ خاموش حیدرآبادی سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

جامِ مئے عرفان سے کردے مجھے مدہوش
ہوجاؤں گا آلام زمانہ سے سبکدوش
نظروں میں میری مسیح ہے آرائش دنیا
ہو نعمتِ گفتار عطائے شہ خاموش

ایک جگہ حیدرآباد سے اُن کی محبت ووارفتگی کا مظاہرہ دیکھئے:

فضا جاں فضا ذرہ ذرہ حسیں ہے
حقیقت میں ملکِ دکن گلِ زمیں ہے
ہر ایک نقشِ تہذیب جو دلنشیں ہے
دلِ حیدرآباد اس کا امیں ہے
اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے
تو بے شک یہیں ہے، یہیں ہے، یہیں ہے
بہت خوشنما شہر دیکھے ہیں میں نے
مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

ایک جگہ اورنگ آباد (ان کے وطن) کے وجدؔ یوں مدح سرا ہیں:

تیری ہر صبح پیغامِ حیاتِ تازہ لاتی ہے
تیری ویرانیوں میں روحِ فردا مسکراتی ہے
تخیل پر میرے منقوش ہے تیری بہار اب تک
میرے آنسو تری الفت کے ہیں آئینہ دار اب تک
تیرے در پر بہارِ نوجوانی چھوڑ آیا ہوں
نیاز و ناز کی پہلی کہانی چھوڑ آیا ہوں

ایلورا کے نقش ونگار، پتھروں پر سنگتراشی کے اعلیٰ نمونوں کو وجدؔ نے اپنے الفاظ میں قید کرلیا ہے۔ دیکھئے:

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دلوں کا سوزِ نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نورِ ازل بت ہے آستینوں میں
حیاتِ جذب ہے، اِن بے شکن جبینوں میں
بنائی تیشہ وروں نے خیال کی دنیا
کھلی ہوئی ہے عروج وزوال کی دنیا
''جنوں نواز جلال و جمال کی دنیا
رہینِ محنتِ ماضی ہے حال کی دنیا''

اُمید پر ایک نظم کا ایک شعر:

تمام نقش مصیبت مٹادیئے تو نے
وہ دلنواز کرشمے دکھادیئے تو نے

اجنتا کی پتھروں کی مورتیوں کے بارے میں وجدؔ یوں تصویر کھینچتے ہیں۔

جہاں کھینچتا رہا پتھر پہ عکس خیروشر ہوں
جہاں قائم رہے گی جنت قلب و جگر ہوں
دلوں پہ عکس کھینچ آیا تھا جن کے حسن عالم
قلم کو نقش ازبر ہوگیا تھا اسمِ اعظم کا
چٹانوں پر شباب وحسن کی موجیں رواں کردیں
فسوں کاروں نے زخموں میں مقید بجلیاں کردیں

ایلورہ اجنتا کی خوبصورتی کو وجدؔ نے اپنے اشعار میں

بند کرلیا تھا۔وجد کی غزلیں بھی نظموں سے کچھ کم نہیں ہیں۔وجدؔ کی غزلوں میں سوز وگداز اورواردات قلبی کا دوٹوک بیان ہمیں ملتا ہے۔غزل میں غنائیت کا اعلیٰ عنصر پایا جاتا ہے جس میں غم جاناں اورغم دوراں کی حکایتیں جابجا دیکھنے کو ملیں گی ۔ملاحظہ کیجئے :

زہرِ غم ہنس ہنس کے پینا چاہئے
موت آنے تک تو جینا چاہئے
ایک تنکا ڈوبنے کا آسرا
کون کہتا ہے سفینہ چاہئے
حسن کے جلوؤں سے جی بھرتا نہیں
ہر قدم پر طور سینا چاہئے
وجدؔ آزادی کے پودے کے لئے
خون سے بڑھ کر پسینہ چاہئے
شوق کی نکتہ دانیاں نہ گئیں
رات بیتی کہانیاں نہ گئیں
حُسن نے دی ہزار بار شکست
عشق کی نثرانیاں نہ گئیں
وجدؔ مایوسیوں کے زور میں بھی
عزم کی کامرانیاں نہ گئیں
درد کو نیچا دکھانا آگیا
چوٹ کھا کر مسکرانا آگیا
مرثیہ خانی سے اب گھٹتا ہے دم
زندگی کا گشت گانا آگیا
اُس کو سب کچھ آگیا سمجھو جسے
دوسروں کے کام آنا آگیا

وجدؔ رکھتے ہیں جوانی میں قدم
حسن کو بجلی گرانا آگیا
فسانہ زندگی کی ہر حقیقت
حقیقت اک محبت کا فسانہ
یہی ہے وقت جاگو سونے والو
نئی کروٹ بدلتا ہے زمانہ
زندگی خون میں نہائی ہے
لوگ سمجھے بہار آئی ہے
خوش دلی دیکھ کر شہیدوں کی
موت شرماکے مسکرائی ہے
دل کا احوال پوچھنے والے
درد ہے اور انتہائی ہے
اور تو آئینے میں عیب نہیں
صاف دل ہے یہی برائی ہے
میں جہاں ہوں وہاں نہیں کوئی
وہ جہاں ہیں وہاں خدائی ہے

وجدؔ نے اُردو نظم اورغزل میں جابجا نئے نئے گل کھلائے ہیں۔شاعری کے لئے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہے۔غزلوں کے یہ چند اشعار قارئین کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ورنہ وجد کی تمام غزلیں پڑھنے اورسر دُھننے کے قابل ہیں۔ بلاشبہ وجدؔ آج اتنے ہی اُردو ادب میں مقبول ہیں جتنے کہ وہ اپنے عہد میں تھے۔طوالت کے ڈر سے یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔تجزیہ پر قارئین کی پسند کا انحصار ہے۔

O-O-O

محمد یوسف شاشتی
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو
حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد

سرسیّد احمد خان کی صحافتی خدمات

سرسیّد احمد خان کی زندگی جس پر آشوب زمانے میں بسر ہوئی۔اس وقت نہ صرف برصغیر بلکہ سارے عالمِ اسلام پر تنزّل اور بربادی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سرسیّد نے اصلاح کا بیڑا اس وقت اٹھایا جب کہ قوم کا شیرازہ بکھر چکا تھا' مسلمانوں پر افسردگی و مُردنی چھائی ہوئی تھی۔طرح طرح کے توہمات اور اختلافات میں مبتلا تھے۔انہوں نے مسلم قوم کے ہر ایک شعبہ زندگی کو گہری نظر سے دیکھا اور ایک ایک گوشہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔کھرے کھوٹے کو اس طرح پرکھا کہ بلا خوف و خطر بڑی اخلاقی جرأت اور بیباکی سے وہ بات کہہ دی اور لکھ دی جسے وہ سچ سمجھتے تھے۔اس پر بڑا شور وغل مچا۔اخباروں میں بہت تو تو میں میں ہوئی۔خاص کر ''اودھ پنچ'' میں ان کے خیالات مسخ کر کے بڑی بھیانک صورت میں پیش کئے گئے۔اور ان کی ہنسی اڑائی گئی۔کافر۔ملحد۔لامذہب۔دجّال کے خطاب دئے گئے۔ اور کفر کے فتوے لکھے گئے۔ان مخالفتوں سے کبھی ان کے دل پر میل نہ آیا بلکہ اس سے ان کے کام میں گرمی اور جوش پیدا ہوگیا۔بعض اوقات وہ بے جا اعتراضوں اور تہمتوں کا جواب بھی لکھتے۔

سرسید نے صحافت کو قومی اصلاح کا وسیلہ جانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد میں جب مسلمان مغلوب ومحکوم تھے' انہوں نے اپنے رسائل میں ایسے مضامین چھاپے جن کا منشا ومقصد برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی تھی۔ان کے صحافتی مضامین جہاں عہد جدید کے تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ تھے وہیں اُن کی ایک ایک سطر برصغیر کے مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دلاتی تھی۔اُن کی صحافتی تحریروں نے زوال پذیر اور محکوم مسلم قوم کو خواب خرگوش سے بھی بیدار کیا۔ انہیں نئے ماحول میں وقار اور عزت سے جینے کا قرینہ بھی سکھایا۔حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد خان کے صحافتی مضامین کا پہلا اور آخری مقصد برصغیر کے مسلمانوں میں انتشار اور بدنظمی کی کیفیت کو ختم کرنا تھا۔سرسید دنیا کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ہیں جو اپنے زمانے کو اپنی بے پناہ قوتِ ارادی وعمل سے متاثر کرسکتی ہیں۔سرسید نے انیسویں صدی کے ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی تقدیر بدلنے اور بنانے میں جو کام کیا ہے وہ تاریخ کے صفحات پر مستند حروف میں ثبت ہے۔وہ قدرت کے ان شاہکاروں اور دنیا کے ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے اندر مختلف نوع کی طاقتیں اور صلاحیتیں رکھنے کی بنا پر کسی قوم کے ایک پہلو کو نہیں بلکہ کئی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں اور ان میں

انقلاب برپا کرتے ہیں۔ سرسید کے اصل میدان دو تھے۔ مذہب اور سیاست۔صحافت ان کا الگ میدان نہیں بلکہ مذکورہ میدانوں پر احاطہ کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔سرسید نے اخباری دنیا سے وابستہ ہوکر اپنے مقاصد کی تکمیل چاہی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ، تہذیب الاخلاق، لائل محمڈنز آف انڈیا جیسے رسائل یا اخبارات کو منزل کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ سرسید کا دور اگرچہ ہندوستانی اخبارات خصوصاً اردو اخبارات کا ابتدائی دور تھا۔انگریز حکمرانوں کا دبدبہ ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً بہت زیادہ تھا۔اس پرآشوب دور میں سرسید نے بے خوفی اور صداقت کو ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیا۔ایسے حالات میں جب خطرات سر پر منڈلا رہے ہوں اور معاشرہ بھی ترقی یافتہ نہ ہو،صحافت کی سچائی اور صداقت کی بنیادوں پر قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔

1838ء میں سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے دہلی کے دوسرے ہفتہ وار اردو اخبار کا اجراء کیا اور اس کا نام ،سیدالاخبار رکھا،جس کی ادارتی ذمے داری ان کے انتقال کے بعد سرسید نے سنبھالی۔اس طرح کہنا چاہئے کہ انہوں نے اپنی علمی وادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہی کیا۔ سیّد احمد خان نے بحیثیت صحافی اسی اخبار سے لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا جو نصب العین بنایا تھا،یعنی مسلم قوم کی اصلاح وترقی ،اس کی تکمیل کے لئے انہیں ایسے ہی پلیٹ فارم کی ضرورت بھی تھی تاکہ وہ وہ عظیم پیامبر عوام تک اپنا پیغام پہنچا سکے،اس اخبار کے اکثر مضامین خود سرسید کے تحریر کردہ ہوتے تھے لیکن یہ اخبار بہت زیادہ ان کا ساتھ نہ دے سکا اور 1850ء میں بند ہوگیا۔ پھر بھی کہنا چاہئے کہ خود سرسید کی صحافتی تربیت کا ذریعہ یہی اخبار بنا۔ بقول سرعبدالقادر:

''سرسید احمد خاں کو صاحب طرز اخبار نویس بنانے میں سیدالاخبار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔''

1863ء میں سرسید نے علوم فنون کو فروغ دینے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔جس میں قدیم مصنفوں کی عمدہ کتابیں اور انگریزی کی مفید کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔۲۹۔جنوری 1864ء کو اس تجویز کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس نام سے غازی پور میں باقاعدہ ایک تنظیم قائم کی۔انہیں دنوں سرسید کا تبادلہ غازی پور سے علی گڑھ ہوگیا،تو اس سوسائٹی کا دفتر بھی وہیں منتقل کرلیا گیا۔۳مارچ 1866ء سے اس سوسائٹی سے ایک اخبار جاری کیا گیا اور اردو نام اخبار سائنٹفک سوسائٹی اور انگریزی نام The Aligarh Gazette institute' طے پایا۔ یہ اخبار سرسید کے آخری دم تک جاری رہا۔اس اخبار سے قبل اردو اخبارات میں اداریے لکھنے کا رواج نہیں تھا،اس گزٹ نے اسے عام کیا اور سرسید نے ایسے اداریے تحریر کیے جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صحافت کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے۔اس طرح یہ اخبار اردو میں مقصدیت کو فروغ دینے والا پہلا اخبار کہا جاسکتا ہے۔انہوں نے اپنے ایک مظمون میں ''اخبار کیسے ہونے چاہیے''اس پر ایک مضمون لکھا تھا۔

کہتے ہیں کہ اخبار قومی ترقی۔ملکی بھلائی عوام کی رہنمائی'خواص کی دلچسپی'حکّام کی ہدایت اور رعایا کی اطاعت کا ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہے۔مگر اس کے دوسرے پہلو پر کم تر نظر کی

جاتی ہے۔اخبار جیسا ذریعہ ان بھلائیوں کا ہے۔ویسا ہی ذریعہ بہت سی برائیوں کا بھی بیلکہ افسوس ہے کہ ہمارا ملک ابھی پہلی قسم کے اخباروں کا نہایت محتاج ہے۔ایسے اخباروں کی کمی سے اور زیادہ تر اخباروں کے پڑھنے لکھنے والوں کے نہ ہونے سے ملک میں جہالت اور ناخواندگی اس قدر پھیلی ہوئی ہے کہ کسی شہر وقصبہ میں پانچ فیصد آدمی بھی اخبار پڑھنے کے لائق نہ نکلیں گے۔ جو نکلیں گے وہ اخبارات پڑھنے کو تضیع اوقات اور بے سود سمجھیں گے۔حوالہ: اخبار رفیق ہند جلد نمبر 1 لاہور 5 جنوری 1884' مشمولہ سرسید احمد خان اور انکا عہد: سریہ حسین۔ص: 226

اس اخبار کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا حالی لکھتے ہیں:''اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک کالم اُردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اُردو میں الگ اور انگریزی میں الگ چھاپے جاتے تھے۔اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات و معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ان میں پولیٹیکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرتا تھا۔'' (حیات جاوید:۱۳۱)۔ ابتدا میں یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کا ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم ہوتا تھا۔ایک کالم پر اُردو اور دوسرے یا اس کے متوازی پر انگریزی میں ترجمہ چھپتا تھا۔اس کام کے لئے سوسائٹی سے با صلاحیت مترجمین کو منتخب کیا گیا اور کتابوں کے ترجمے کا ایک طویل پروگرام بھی مرتب ہوا۔جس سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی روایت مقبول ہوئی۔8 ستمبر 1876ء میں ایک خاصی تبدیلی ہوئی۔جگت سنگھ رئیس نے اپنا پریس مع اخبار پروگیس سائنٹیفک سوسائٹی کو مرحمت فرمایا جس کے بعد اخبار پر یہ بھی لکھا جانے لگا:

''علی گڑھ گزٹ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس میں اخبار پروگریس بھی ضم ہوگیا''۔

اس اخبار نے اُردو قارئین کے باشعور طبقہ کے ذہنوں کو کافی حد تک متاثر کیا اور انہیں جدید علوم وفنون کی طرف راغب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔جس سے ہندوستانیوں کے جامد تصورات متحرک کرنے میں مدد ملی۔اس کا اجراء اگرچہ ایک ہفتہ وار کی حیثیت سے ہوا لیکن جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے،اس سے ان کا مقصد مسلمانوں کو تقلیدی دائرے سے نکال کر ان کے اخلاق کی تہذیب کرنا تھا۔سرسیّد کے تبصروں میں انگریزی انداز صحافت کے اثرات نمایاں تھے۔ان کے خیال میں صحافی کے فرائض تین قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ صحافی صلاح دینے والا ہو۔

۲۔ تربیت کرنے والا ہو۔

۳۔ معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہو۔

ایک ہوش مند اور باخبر صحافی کی طرح انہوں نے انگریزی اخبارات کا مقابلہ مقامی زبانوں کے اخباروں سے کیا۔اور اخبار نویسوں کو جھوٹ اور تہمت کے خلاف احتجاج پر آمادہ کیا۔

''اخبار پانیر نے جن دیسی اخباروں کی بعض رائیوں کا خلاصہ اپنے پرچے میں درج فرمایا ہے۔ ہم بھی ان کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ دیکھو ہماری ہمدردیوں کو انگریزی خلاصہ نویس کیسا خاک میں ملاتے ہیں۔اور تم کو کیسا

بناتے ہیں۔ اور جب وہ ان رایوں کو ایسی خراب حالت میں پیش کریں گے تو گورنمنٹ کیا خاک ہمارے خیالات کی قدر کرے گی۔ اگر ہم ہندوستانیوں نے اس موقع اور وقت کو ہاتھ سے کھودیا اور کوئی مناسب تدبیر نہ کی تو آئندہ نہایت ہی افسوس ہوگا۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ دیسی اخبار نویس جو اس الزام میں پھنسائے گئے ہیں، نہایت توجہ سے اس مضمون کو پڑھیں گے اور ہرگز اپنی رسوائی گوارہ نہ کریں گے۔''

حوالہ۔ علی گڑھ گزٹ انسٹیٹیوٹ۔ گزٹ جلد۔ 8 شمارہ نمبر۔ 218 م۔ .1873 مشمولہ۔ سرسید احمد خان اور ان کا عہد۔ سریہ حسین۔ص: 227

سرسید صحافت کے اصول وقوانین سے آگاہ ایک پختہ کار صحافی کی طرح آزادیٔ رائے کا احترام کرتے تھے۔ وہ غور وخوض کے بعد ہر ایک چیز کے بارے میں خود رائے قائم کرتے اور اس کا اظہار بھی بے خوف وخطر کردیتے تھے۔ جس کا ثبوت گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے اداریوں اور متفرق مضامین سے مل جاتا ہے۔

سرسید کی صحافتی خدمات کا سب سے بڑا کارنامہ ''تہذیب الاخلاق'' ہے جس کا انگریزی نام ''SocialThe Mohammedan Reformer'' تھا۔ سرسید اپنے انگلستان کے سفر سے واپسی کے ساتھ ہی اس کے اجرا کا خواب اور سرناموں کی تختیاں ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ ان کے ولایت سے واپسی کے دو مہینے بعد شائع ہوا۔

گویا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کو سرسیّد نے نہ صرف ان کی پستی وذلت کا سبب جانا بلکہ اس کو دور کرنے کے لیے فکرمند بھی ہوئے۔ ان کو یقین ہوچلا تھا کہ اگر قوم میں نئی روح پھونکنی ہے اور اس کو غیر قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا ہے تو سوائے تعلیم کے کوئی دوسرا راستہ نہیں جو منزل تک لے جاسکے اور قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو کنارے لگاسکے۔ سرسیّد مرحوم کو اس سلسلہ میں کیا فکرمندیاں لاحق تھیں اس کا اندازہ صرف ان دو جملوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

''جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کردیا اور میرے بال سفید کردیئے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''آخر کو یقین ہوگیا کہ جب تک ہندوستان میں تعلیم عام نہ ہوگی ان خرابیوں کا کلّی انسداد کسی طرح نہیں ہوسکتا''۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۷۶ء مشمولہ عبدالحی، اردو صحافت اور سرسیّد احمد خان۔ص: ۹۷۔

تعلیم اور تہذیب (جس سے کہ انگریز قوم مالا مال تھی) کے کیا طریقۂ کار انہوں نے اپنائے، کن کن تدبیروں سے وہ اس درجہ تک پہنچے، اس کو جاننے اور سمجھنے، اور سمجھنے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اس کو برتنے کی غرض سے سرسیّد نے انگلستان کے سفر کی نیت کی اور اپریل 1869ء میں اپنے دونوں بیٹوں سیّد محمود اور سیّد حامد کے ساتھ رختِ سفر باندھا اور لندن جاکر طریقہ تعلیم کو اچھی طرح دیکھا اور سمجھا۔ اپنے اسی مقصد کو سرسیّد یوں بیان کرتے ہیں:

''میرا ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقہ تعلیم کو دیکھنا تھا اور اس پر غور کرنا تھا، چنانچہ اس غرض سے کیمبرج

یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی اور چھوٹی چیز کو غور سے دیکھا، تمام نقشہ ذہن نشین کر لیا اور عام تعلیم پر غور کیا۔'' (عظیم الشان صدیقی۔ مشاہیر کی آپ بیتیاں۔ ص: ۵۷)

قیامِ لندن ہی کے دوران سرسیّد نے نہ صرف تعلیم کی تمام تجاویز مرتب کر لی تھیں بلکہ کالج کا نقشہ بھی وہیں بنوالیا تھا۔ اپنے اس تعلیمی مشن کو شروع کرنے کی کچھ ترکیبیں بھی تجویز کی تھیں جن میں سے ایک اس طرح تھی:

''ایک ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے عموماً خیالات تعصب جو مسلمانوں کے دِلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور یورپین سائنسز اور لٹریچر کا پڑھنا کفر اور مذہب اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں، دور ہوں۔'' (رسالہ تہذیب الاخلاق۔ یکم شوال، ۱۲۸۷ھ جلد اول)۔

اس تجویز کو بروئے عمل لانے کی خاطر سرسیّد نے ہندوستان آ کر وہ انقلابی رسالہ جاری کیا جس کو لوگ 'تہذیب الاخلاق' کے نام سے جانتے ہیں۔ رسالہ کیا تھا بم تھا' جس نے خوابیدہ قوم کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس رسالہ کے ذریعہ ملت کے افراد کو صحافت کا وہ رنگ دیکھنے کو ملا جو اس سے قبل نہیں دیکھا گیا تھا۔ ایک ایسا رسالہ جس میں نہ خبریں ہوتی تھیں نہ گھسے پٹے موضوعات پر بے اثر مضامین' بلکہ رسالہ اپنے جلو میں انقلاب کے ایسے ایسے رنگ لایا جو کبھی قوم نے دیکھے نہ تھے، رسالہ نے ایسی ایسی صدائیں قوم کے کانوں میں ڈالیں جو اس سے پہلے کبھی پڑی نہ تھیں۔ رسالہ میں قوم نے کبھی سیاست کے نقارے سنے' کبھی اپنی مفلوک الحالی اور بے سروسامانی کی سسکیاں بھی، اس رسالہ میں ملت نے اپنی تعلیمی محرومی کو الفاظ کا جامہ پہنے دیکھا تو کبھی انگریز حکومت کی مدح سرائی بھی پڑھنے کو ملی، کبھی یہ رسالہ ان کو دین و دنیا سنوارنے کی دعوت دینے والا واعظ نظر آیا، کبھی قوم کی اخلاقی اور نفسانی بیماریوں پر انگلی رکھنے والا معالج دکھائی دیا۔ غرض زندگی کا کون سا شعبہ اور زیست کا کون سا پہلو ایسا ہے جس پر اس رسالہ نے قوم کو جگایا نہ ہو۔

رسالہ کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر 1870ء مطابق یکم شوال 1287ھ کو شائع ہوا اُردو نام 'تہذیب الاخلاق' اور انگریزی نام 'Social Mohammeden The Reformer' رکھا گیا۔ سرورق پر عربی میں ایک عبارت یوں لکھی ہوتی تھی: ''حب القوم من الایمان فمن یسع فی عزاز قومہ نما یسعی فی عزاز دینہ۔ ''البتہ مضامین کی زبان صرف اُردو تھی۔ رسالہ ماہانہ ہوگا یا پندرہ روزہ کوئی طے نہیں تھا اسی لیے رسالہ کے پہلے شمارہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی کہ:

''یہ پرچہ مہینہ میں ایک بار یا دو بار جیسا کہ مقتضائے مضامین ہوگا چھپا کرے گا۔''

سرسیّد نے رسالہ کے اغراض و مقاصد پہلے ہی شمارہ میں واضح کر دیئے تھے۔ لکھتے ہیں:

''اس پرچہ کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔''

مزید لکھتے ہیں:

''اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحم دِلی کو کمال کے درجہ پر پہنچانے والی ہیں، مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانہ میں مفید تھیں مگر حال کے زمانہ میں نہایت مضر ہوگئی ہیں چھوڑنا چاہیے''۔(رسالہ تہذیب الاخلاق۔یکم شوال، ۱۲۸۷ھ جلد اول)۔

گویا کہ رسالہ کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی اور تہذیبی پستی کے قعرِ مذلت سے نکال کر مہذب قوموں کے شانہ بشانہ کھڑا کرنا اور پرانی فرسودہ مذہبی رسوم و تقالید کے طوق غلامی سے نجات دلانا تھا۔آخر الذکر مقصد کی خاطر سرسیّد اور ان کے رفقاء قلم کار کے قلم سے مذہبی امور سے متعلق کچھ ایسی باتیں سپرد قرطاس ہوئیں جو خصوصاً طبقہ علماء کے لیے دل کی پھانس بن گئیں۔ خاص طور پر دنیا کا چھ دن میں بن جانا، قصّہ آدم، شیطان اور فرشتوں کو تمثیل قرار دینا، جنت وجہنم کو استعارہ سے تعبیر کرنا وغیرہ۔ یہ وہ اُمور ہیں جن کو 'تہذیب الاخلاق' میں جگہ دی گئی اور نتیجتاً ایک فضا 'تہذیب الاخلاق' کے خلاف بنتی چلی گئی اور صرف دو مہینے بعد ہی ان افکار کی تردید اور مخالفت میں کانپور سے دو پرچے مولانا امداد علی نے جاری کئے پہلا 'نورالانوار' جو کہ جنوری 1871 نکو نکالا اور دوسرا 'نورالآفاق' اگست 1871ء کو۔ان دو پرچوں کے علاوہ دیگر اہم مخالف پرچے اس طرح ہیں:

لیکن مخالفت کے باوُجود تہذیب الاخلاق' کے قدم اپنے مشن سے ڈگمگائے نہیں، کیونکہ 'تہذیب الاخلاق' اور اس کے لکھنے والے (ان کی دینی آراء سے قطع نظر) اپنی نیت میں مخلص تھے۔اور اسی طرح مخالفین بھی اخلاص ہی کا دامن تھامے ہوئے تھے۔'روحِ صحافت' میں امداد صابری رقم طراز ہیں:

''جو شخص بھی 'تہذیب الاخلاق' اور اس کے مخالف اخبارات کا مطالعہ کرے گا، اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ دونوں طبقے اپنی اپنی جگہ نیک نیت اور مخلص تھے'' منقول۔اردو صحافت اور سرسیّد احمد خان۔

اس کے باوجود دونوں میں فرق یہ تھا کہ تہذیب الاخلاق نے کبھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا جبکہ مخالفین نے ہر بے اعتدالی اور طعن وتشنیع کو روا رکھا۔

'تہذیب الاخلاق' اپنے مشن میں کامیاب ہوا یا نہیں، اس کا اثر قوم کے کس طبقہ پر پڑا اور کونسا طبقہ اس کے زیرِ اثر نہ آسکا، اس سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالؔی کی یہ تحریر رہنمائی کرتی ہے، لکھتے ہیں:

'''تہذیب الاخلاق' کے جاری ہونے سے رفتہ رفتہ ایک معتدبہ گروہ مسلمانوں میں ایسا بھی پیدا ہوگیا جو اس پرچہ کا ویسا ہی دلدادہ تھا جیسے انگلستان والے 'ٹیٹلر اور 'اسپیکٹیٹر' کے دلدادہ تھے، وہ اس کے مضامین پر وجد کرتے تھے اور تاریخ معین پر اس کے انتظار میں ہمہ تن چشم رہتے تھے۔اگر سرسیّد یہ پرچہ جاری نہ کرتے اور مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کا اظہار چھوڑ دیتے، بلکہ صرف ان کی تعلیم کا انتظام کرتے تو ظاہراً ان کی مخالفت کم ہوتی بلکہ شاید نہ ہوتی، مگر اس کے ساتھ ہی اعانت اور امداد بھی کم ہوتی اور جو تحریک چند سال میں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی اس کا صدیوں تک کہیں نام ونشان نہ ہوتا''۔ الطاف حسین حالؔی۔آب حیات۔ص ۱۶۵۔

○-○-○

فہمیدہ بیگم
ریسرچ اسکالر، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

پروفیسر محمد علی آثرؔ کے وضاحتی اشاریے

سرزمین دکن ازل ہی سے بڑی مردم خیز واقع ہوئی ہے۔ یہاں ہر دور میں صاحبانِ علم وفن پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنے علم وفضل کے ذریعہ اس خطۂ زمین کی تہذیب' ثقافت' زبان وبیان کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کو دوام بخشنے کے لیے اپنی علمی فراست کو بروئے کار بھی لایا۔ ایسے ہی علم وادب کے شہسواروں میں پروفیسر محمد علی آثرؔ کا شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنے عمر عزیز کو صرف اور صرف دکنیات کے لیے مختص کر دیا جو اپنے آپ میں کسی کارنامے سے کم نہیں۔ آثرؔ صاحب نہ صرف اعلیٰ پائے کے محقق ہیں بلکہ ایک خوش فکر شاعر بھی ہیں۔ آپ مہر ومحبت کی سرزمین حیدرآباد میں 24 نومبر 1949ء کو حکیم محبوب علی کے گھر تولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ اُردو شریف سے حاصل کی اور یہیں سے 1965ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ بعد ازاں 1968ء میں انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کی اور 1971ء میں انوار العلوم کالج سے ہی بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ عثمانیہ کا رخ کیا جہاں سے 1974ء میں امتیاز کے ساتھ ایم۔اے مکمل کیا۔ ایم۔اے کے سال آخر میں انہوں نے ''غواصی شخصیت اور فن'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ اور 1980ء میں پروفیسر غلام عمر محمد خان کی زیرنگرانی ''دکنی غزل'' کے عنوان پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔ پروفیسر محمد علی آثرؔ نے دوران تعلیم ہی 1975ء میں اپنی عملی زندگی کا آغاز بہ حیثیت لکچرر کیا۔ بعد ازاں 1982ء میں ان کا باقاعدہ تقرر شعبہ اُردو' جامعہ عثمانیہ میں ہوا۔ 1987ء لیڈر بنائے گئے اور ترقی کرتے کرتے 1998ء میں پروفیسر شپ پر فائز ہوئے۔ پروفیسر محمد علی آثرؔ کی ملازمت کا بڑا حصہ شعبہ اُردو' ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں گزرا بلکہ وہ یہیں وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئے۔

ان کی تصانیف میں ملاقات' حرفِ نیم دیدہ، نعتِ رسول خدا' بیاضِ اثر' اللہ جلِ جلالہٗ انوارِ خط روشن' خرابے میں روشنی' غواصی شخصیت اور فن' دکنی غزل' دکنی شاعری تحقیق' تنقید' تحقیقی نقوش' نوادراتِ تحقیق' مقالاتِ اثر' تحقیقات اثر' دکنی کی تین مثنویاں' دکنی غزلوں کا انتخاب' دیوانِ عبداللہ قطب شاہ' [بہ اشتراک ڈاکٹر محمد عطا اللہ خان]' مثنوی اشتیاق نامہ' شمع جلتی رہے' دبستان گولکنڈہ ادب اور کلچر' نظیر شناسی [بہ اشتراک پروفیسر مرزا اکبر علی

بیگ] ' جنوب کا شعر وادب' خامہ درخامہ' ڈاکٹر محی الدین قادری زور' اصغر ویلوری فن اور شخصیت' لفظوں کی مہک' وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر محمد علی آثر دکنی ادب کے بلند مرتبت محقق ہیں۔ انہوں نے دکنی شعر و ادب کی تحقیق وتحسین میں گراں قدر خدمت انجام دی ہیں اور کئی شاعروں اور ان کی تخلیقات کو پہلی مرتبہ متعارف کرایا ہے۔

تحقیق میں وضاحتی اشاریوں یا Descriptive Catalogue کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔وضاحتی اشاریہ سازی کا شمار حوالہ جاتی تحقیق میں ہوتا ہے۔ وضاحتی اشاریوں کی مدد سے کوئی بھی ریسرچ اسکالر یا محقق یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس کی مطلوبہ کتاب یا مخطوطہ کس کتب خانے میں ہے۔ کتب مخطوطے کی نشاندہی کے علاوہ وضاحتی اشارے میں اس کا مختصر لیکن جامع تعارف بھی کرایا جاتا ہے۔ پروفیسر محمد علی آثر نے وضاحتی اشاریہ سازی کے میدان میں بھی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے درجہ ذیل وضاحتی اشاریے تیار کیے ہیں۔

(1) تذکرہ اُردو مخطوطات جلد اول (2) تذکرہ اُردو مخطوطات جلد ششم (3) دکنی اور دکنیات (4) کتب خانہ سالار جنگ میوزیم کے اُردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔

ذیل میں پروفیسر محمد علی آثر کی ترتیب دی ہوئی وضاحتی فہرستوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔''دکنی اور دکنیات'' اس کتاب میں جملہ 237 دکنیات سے متعلق کتابوں کی وضاحتی فہرستیں پیش کی گئی ہے۔حرف آغاز کے تحت پروفیسر محمد علی آثر نے لکھا ہے کہ اُردو میں وضاحتی فہرست کا چلن نہ کے برابر ہے' اس سلسلے میں اب تک صرف ایک ہی وضاحتی کتاب 1976ء میں شائع ہوئی جیسے پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر مظفر حنفی نے مرتب کیا تھا' اس کے بعد تا حال کئی وضاحتی فہرستیں شائع ہوئیں۔

زیر تذکرہ کتاب دکنی اور دکنیات کی ابتداء دکنی مثنوی ابراہیم نامہ کے وضاحتی اشاریہ سے ہوتی ہے' اس میں انہوں نے نہ صرف اس کے مرتب کا نام درج کیا بلکہ ناشر' تاریخ اشاعت' مطبع' قیمت اور سائز صفحات' مجلد' ایڈیشن کی تفصیل ، تعداد اشاعت وغیرہ کے علاوہ مذکورہ مجموعہ کے شاعر ابراہیم عادل شاہ ثانی کی زندگی اور کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی طرح انہوں نے کتاب میں موجود دکنیات سے متعلق 237 تصانیف کا وضاحتی اشاریہ پیش کیا ہے۔آخر میں جامعہ عثمانیہ کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالوں [پی ایچ۔ڈی کے دس' ایم فل کے مقالے سات اور ایم۔اے کے چھ] کی تفصیل دی ہے۔ نیز دکنی سے متعلق رسائل میں شائع شدہ مضامین کا اشاریہ بھی دیا ہے۔اس کے بعد اشاریہ مصنفین' اشاریہ (کتب خانہ) اور شخصی کتب خانوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

پروفیسر محمد علی آثر کے کتب خانہ سالار جنگ میں موجود اُردو خطوطات کی وضاحتی فہرست جسے نصیر الدین ہاشمی نے مرتب کیا تھا' اس میں انہوں نے ترمیم واضافہ بھی کیا۔ کتاب کا دیباچہ اس وقت کے ریاستی گورنر

این۔ڈی۔تیواری نے تحریر کیا تھا جبکہ یہ کتاب سالار جنگ میوزیم کے ڈائریکٹر ڈاکٹر اے۔کے۔وی۔ایس ریڈی کی زیرنگرانی شائع ہوئی اور یہ خود اس کے ناشر بھی ہیں۔کتاب کا پیش لفظ پروفیسر محمد علی اثرؔ نے پیش گفت کے تحت تحریر کیا ہے۔

اس ترمیم واضافہ شدہ وضاحتی فہرست میں ڈاکٹر اثرؔ نے مختلف علوم وفنون کو عنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے۔ مثلاً اسلامیات' مذاہب' فلسفہ' سائنس' کا رآمد فنون' فنون لطیفہ' لسانیات وغیرہ وغیرہ۔

وضاحتی فہرست کی ابتداء زمرہ اسلامیات سے کی گئی ہے جس میں تجوید کے متعلق پانچ وضاحتی فہرستیں جبکہ تفسیر وترجمہ قرآن کے حوالے سے دس' اسی طرح حدیث کے متعلق چھ' فقہ اور عقائد پر 124 پند ونصائح پر 13' کلام و مناظر پر 23' ادعیہ پر 13' تصوف واخلاق پر 164 وضاحتیں کی گئی ہیں۔اسی طرح مذاہب کے عنوان سے ہندو مذہب پر سات وضاحتیں ملتی ہیں جبکہ فلسفہ کے تحت فلسفہ ومنطق پر تین' رمل' نجوم' جفر پر 23 وضاحتیں شامل ہیں۔سائنس کے باب میں طبیعات پر ایک' ہیئت پر پانچ' ریاضی پر آٹھ' کیمیاء پر ایک وضاحت درج ہے' اس کے بعد کارآمد فنون کے زیر عنوان قانون پر پانچ' معاشیات پر ایک' سیاہ گری پر تین' شطرنج وغیرہ پر چار' طبی یونانی' ڈاکٹری پر نو' طبِ حیوانات پر چار جبکہ جنسیات پر ایک وضاحت ملتی ہے۔فنون لطیفہ کے تحت موسیقی پر چار ہیں۔لسانیات کے زمرہ میں لغت پر سترہ' حرف ونحو پر تین' عروض و بلاغت پر سات' اور پہیلیاں وغیرہ پر دو مخطوطات کا تعارف درج ہے۔

پروفیسر محمد علی اثرؔ نے سالار جنگ میوزیم میں موجود جن وضاحتی فہرستوں میں ترمیم واضافہ کیا ہے وہ اپنے آپ میں اتنا جامع ہے کہ ایک ایک وضاحتی فہرست کی تفصیلات سے ہم آگاہ ہو جاتے ہیں۔مثلاً نمبر ایک کتاب' داخلہ نمبر' سائز' سطر' خط' کاغذ' مترجم' تاریخ ترجمہ وغیرہ کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے مذکورہ موضوع کے متعلق جو نیا تحقیقی مواد سامنے آیا ہے اس کی معلومات بھی درج کی ہیں۔

پروفیسر محمد علی اثرؔ نے ادارہ ادبیات اُردو میں موجود تذکرہ اُردو مخطوطات مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں بھی ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم کی زیرنگرانی ترتیب دیا گیا یہ تذکرہ 1943ء میں شائع ہوا تھا جبکہ اس کی اشاعت دوم 1996ء میں عمل میں آئی تھی۔ اس فہرست میں مخطوطات مندرجہ ذیل موضوعات کی مناسبت سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔مختلف علوم وفنون کے تحت ترتیب دی گئی ان وضاحتی فہرستوں کی ابتدا میں' علوم قرآن وحدیث پر چار' فقہ پر سولہ' تصوف پر اڑتیس' پند' اصلاح' تبلیغ و مناجات انتالیس' تاریخ سیر ومناقب کے باب میں مختلف ذیلی عنوانات حالات ومناقب نبیؐ عربی پر تئیس' حالات و مناقب آل واصحاب نبیؐ پر سینتالیس' حالات ومناقب محبوب سبحانی پر چھ' دیگر بزرگان مذاہب کے حالات و مناقب پر پانچ' سلاطین وامراء کے حالات وواقعات پر آٹھ مخطوطات کی وضاحت ملتی ہے۔اس کے علاوہ باب نظم کے تحت دیوان کلیات وبیاضی کے تحت اکیاون' منظوم قصے کے تحت

اٹھائیس' نثری قصے کے تحت پندرہ' لغت وعروج انشاء کے تحت چھ' طب کے تحت سات' اور سائنس و دیگر علوم کے تحت مخطوطات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

اسی طرح جلد اول کے باب دوم میں مختلف دکنی مخطوطات کی وضاحتی فہرست شامل ہے جو کل 275 مخطوطات پر مبنی ہے۔ اس وضاحتی فہرست میں مخطوطات کا نام' اوراق' ابتدائی اور اق' سطور فی صفحہ' بقیہ' تقطیع' خط' عنوانات' سنہ تصنیف' مصنف' کاتب جیسے عنوانات کی ضاحت پیش کی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مخطوطات کے مصنفین کے حالات زندگی عہد اور فکر وفن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ اس وضاحتی فہرست میں ضمیمے پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں معطئین مخطوطات کے اسمائے گرامی اور مخطوطات کی فہرست بہ لحاظ زمانہ' مصنف' سنہ تصنیف' موضوع' صنف' نمبر' صفحہ وغیرہ کی تفصیل دی گئی ہے۔ وضاحتی فہرست کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے جس کی مرتبہ راحت سلطانہ ہیں۔

ادارہ ادبیات اُردو (حیدرآباد) کے کتب خانہ میں ہزاروں عربی و فارسی اور اُردو کے ہزاروں مخطوطات محفوظ ہیں۔ ان مخطوطات کی جمع آوری ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی محنت لگن اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف ان مخطوطات کو جمع کیا بلکہ ان کی وضاحتی فہرستیں بھی مرتب کیں۔ انہوں نے ادارہ ادبیات کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست پانچ جلدوں میں مرتب کی۔ ان کے انتقال کے بعد ادارہ ادبیات کے باقی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام مولوی اکبرالدین صدیقی (ریڈر جامعہ عثمانیہ) اور محمد علی اثرؔ نے مل کر انجام دیا۔

وضاحتی فہرست کے دیباچے میں محمد اکبرالدین صدیقی رقمطراز ہیں:

''پیش نظر تذکرہ مخطوطات میں پانچوں جلدوں کی اجمالی فہرست شامل ہے اس لئے کہ پانچوں جلدیں اب کمیاب ہیں۔ اس جلد میں دوسو پچاس مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن مخطوطات کو موضوع کے اعتبار سے تقسیم نہ کیا جاسکا ہے اس لیے کہ سابقہ مخطوطات کی طرح اس میں بھی ایسے مخطوطات شامل ہیں جو موضوع کے اختلاف کے باوجود ایک جلد میں ہیں۔''

جلد اول کی طرح جلد ششم میں بھی' مخطوطہ کا نام و مصنف' اوراق' تقطیع' کاغذ' خط' سطر وغیرہ وغیرہ کی تفصیلات درج ہیں۔ موضوع سے متعلق مختصر وضاحت بھی کی گئی ہے۔ اس کا اشاریہ محترمہ راحت سلطانہ نے مرتب کیا ہے اور آخر میں ضمیمہ کے تحت کتب اور اشخاص کے نام کسی وجہ سے شامل نہیں ہوئے تھے' ان کی بھی تفصیل دی گئی ہے۔

اس کے علاوہ معطئین مخطوطات جلد ششم کے اسمائے گرامی مندرج ہیں۔ مخطوطات اُردو' فارسی' عربی اور ہندی' مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اور آخر میں مختلف کتب خانوں کی فہرست دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا دکنی مخطوطات و کتابوں سے متعلق پروفیسر محمد علی اثرؔ نے جس جانفشانی کے ساتھ وضاحتی فہرست ترتیب دی ہے وہ اپنے آپ میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

O-O-O

ڈاکٹر نوری خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر (سی)
عثمانیہ یونیورسٹی کالج فار ویمنس
کوٹھی۔حیدرآباد

لطف النساء امتیاز بحیثیت مثنوی گو شاعرہ

لطف النساء امتیازؔ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہیں۔لطف النساء بیگم نام اور امتیازؔ تخلص تھا۔امتیازؔ اورنگ آباد کے استادِ سخن اور تذکرہ نگار اسد علی خاں تمناؔ کی زوجہ تھیں۔

لطف النساء امتیازؔ کو سب سے پہلے اردو دنیا سے متعارف کروانے کا سہرا مولوی نصیرالدین ہاشمی کے سر ہے۔اپنی کتاب ''کتب خانہ سالار جنگ کے اردو مخطوطات'' مطبوعہ ۱۹۵۷ء میں وہ لکھتے ہیں۔

''امتیاز دکن کا شاعر تھا۔ہم کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کس کا شاگرد تھا۔اس کا حال کسی قدیم اور جدید تذکرے میں نہیں ہے ..... اختتامی شعر میں لفظ ''کنیز'' آیا ہے، اِس سے خیال ہوتا ہے کہ امتیازؔ کوئی شاعرہ ہو۔''

نصیرالدین ہاشمی اپنی ایک اور تصنیف ''دکن میں اردو'' میں، امتیازؔ کے تعلق سے رقم طراز ہیں کہ:

''لطف النساء بیگم نام اور امتیازؔ تخلص تھا۔حیدرآباد وطن، ماں کا بچپن میں انتقال ہوگیا تھا اس لیے شاہی خاندان میں پرورش ہوئی۔اسد علی خاں تمناؔ سے بیاہی گئی مگر جوانی میں بیوہ ہوگئی۔''

ڈاکٹر اشرف رفیع اپنے ایک مضمون ''اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ'' میں تحریر کرتی ہیں:

''کل کی تحقیق نے ماہ لقا چندا بائی کو پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ کا رتبہ عطا کیا تھا مگر آج اسی تحقیق نے لطف النساء امتیازؔ کے سر پر اولیت کا تاج رکھا ہے۔''

سن ۱۹۷۹ء میں جامعہ عثمانیہ کی ایک پی ایچ۔ڈی اسکالر مہر جہاں اپنے مقالہ ''اسد علی خاں تمناؔ حیات اور کارنامے'' میں تمناؔ کی زوجہ امتیازؔ کے بارے میں کہتی ہیں کہ:

''اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیازؔ'' میر اسد علی خاں تمناؔ کی رفیق حیات تھیں۔امتیازؔ کے بارے میں بھی ادبی تاریخیں اور تذکرے بالکل اسی طرح خاموش ہیں جس طرح تمناؔ کے تعلق سے خاموش ہیں۔ان دونوں کے بارے میں اس عہد کی خاموشی بڑی معنی خیز ہے کیونکہ دونوں میاں بیوی اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے اس دور کی ممتاز شخصیتیں رہی ہیں۔''

پروفیسر محمد علی اثرؔ اپنی کتاب ''بصارت سے بصیرت تک'' میں امتیازؔ کے متعلق اس طرح رقمطراز ہیں:

''جہاں تک اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کا تعلق ہے مولوی نصیرالدین ہاشمی نے سب پہلے ڈاکٹر زورؔ

اور دیگر محققین کے خیال سے کہ ''مہہ لقابائی اردو کی پہلی صاحب دیوان ہے'' اختلاف کرتے ہوئے ابتداءً کتب خانہ سالار جنگ کی فہرست مخطوطات میں اور پھر بعد کو اپنی کتاب ''دکنی کے چند تحقیقی مضامین'' میں اطلاع دی ہے کہ امتیازؔ کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں اور مہہ لقابائی چندا کا دیوان مرتبہ (۱۲۱۳ھ) سے ایک سال قبل مرتب ہو چکا تھا۔''

تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ لطف النساء امتیازؔ اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہے کیوں کہ جدید تحقیق کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی ہے کہ خود لطف النساء امتیاز نے اپنے دیوان میں موجود ایک سوانحی مثنوی میں یہ اطلاع دی ہے کہ اس نے اپنا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب کیا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیے:

کیا سن ہے ہجری کو میں جب عیاں
ہوئے یک ہزار دوسو پہ بارا ہے جاں
۱۲۱۲ھ

امتیازؔ نے اپنے دیوان میں موجود مثنوی ''سوانحی حالات'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے 36 سال میں اس دیوان کو مرتب کیا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ ۳۶ سال امتیاز کی ولادت سے شروع ہوتے ہیں یا پھر سن شعور (مشق سخن) کا دور ہے۔ اِس کے متعلق نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ ''اس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں مرتب ہوا اس میں اس نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ دیوان اس نے چھتیس سال کے سن میں مرتب کیا ہے اس لیے اس کی پیدائش ۱۱۷۶ ہجری میں قرار پاتی ہے۔''

لیکن ڈاکٹر اشرف رفیع اس بات سے اختلاف کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''مثنوی میں دو شعر ایسے ملتے ہیں جن میں چھتیس کا عدد آیا ہے جس سے چھتیس سال کی عمر میں دیوان مرتب ہونا اخذ نہیں ہوتا۔ اس سے صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیاہتا زندگی کے چھتیس سال بعد شاعرہ کے شوہر تمنا کا انتقال ہوا ہے۔

پروفیسر محمد علی اثرؔ اپنی کتاب ''بصارت سے بصیرت تک'' میں اس طرح فرماتے ہیں کہ:

''پروفیسر محمود قادری نے اپنی تصانیف ''تلاش زبان وادب'' (ص ۱۷۷) اور مقالات محمود قادری (ص ۱۱۷) میں کلام امتیاز کی اندرونی شہادتوں سے ثابت کیا کہ دیوان امتیازؔ ۳۶ سال کی عمر میں نہیں بلکہ اس کی شادی کے ۳۶ سال بعد مرتب ہوا۔ اس طرح امتیازؔ کا سنہ پیدائش پروفیسر اشرف نے ۱۱۵۴ھ، ۱۱۵۵ھ اور پروفیسر قادری نے ۱۱۵۵ھ متعین کیا ہے۔''

امتیازؔ کے حالاتِ زندگی:

لطف النساء امتیازؔ نے اپنے دیوان میں موجود ایک مثنوی ''سوانحی حالات'' میں اپنی زندگی کے اہم واقعات نظم کر دیے ہیں جس سے ہم اس کے بچپن کے حالات، تعلیم و تربیت، اسد علی خاں تمناؔ سے شادی، شعر و شاعری اور تمناؔ کی وفات؛ امتیازؔ کی بیوگی کا غم اور تڑپ تک کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔

تمناؔ کے انتقال کے بعد امتیازؔ تنہا رہ گئی تھیں چونکہ انہوں نے اپنی مثنوی میں خود تحریر کیا ہے کہ وہ لاولد تھیں اس لیے

غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ اب انہیں غمِ دوراں کی فکر بھی لاحق ہوئی۔ لہذا انہوں نے اورنگ آباد سے ہجرت کی اور حیدرآباد منتقل ہوئیں اور نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے دربار سے منسلک ہوئیں۔ چنانچہ انہوں نے نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی مدح میں کئی قصائد موزوں کئے ہیں۔ دو اشعار ملاحظہ کیجئے:

نظامِ دکن شاہ والا تبار
ہے زیب آورِ تخت و تاجدار
ہے آصف اسی دور کا بے شبہ
رعایا پہ ہے لطفِ پروردگار

امتیاؔز کے آخری زمانے کے حالات سے ہم ابھی تک ناواقف ہیں کہ انہوں نے کتنی عمر پائی۔ اپنی زندگی کے باقی دن کہاں گزارے، کب اور کن حالات میں ان کا انتقال ہوا اور کس جگہ وہ مدفون ہے لیکن دنیائے ادب میں ان کا چھوڑا ہوا یہ دیوان ان کا نام، ان کی پہچان اور ان کی شہرت کو باقی رکھنے کے لیے کافی ہے جس میں اس نے اپنے کمالِ فن کے جوہر دکھائے ہیں اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کا لوہا منوایا ہے۔

''کلیاتِ امتیاز'' کی تدوین واشاعت ڈاکٹر احمد علی شکیل نے ۲۰۱۲ء میں کی ہے جس میں امتیاؔز کے سارے کلام کو یکجا کیا گیا ہے سوائے ان کی طویل مثنوی ''گلشن شعراء'' کے۔

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کی طرح اس نے اپنے دیوان میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں، قصائد، مثنوی، مخمسات، مسدسات، رباعیات، قطعات وغیرہ میں اپنی قادر الکلامی اور پُرگوئی کا ثبوت پیش کیا۔ ان کے دیوان کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس دور میں شاعری کا آغاز کیا اور دیوان ترتیب دیا جس دور میں مردوں نے شاعری کے میدان میں اپنا سکہ جمالیا تھا۔ اسلام نے حصولِ علم کو مرد وعورت دونوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود زمانہ قدیم ہی سے مردوں کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی گئی اور عورتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ایسے حالات میں جہاں ہمیں شعروشاعری میں متعدد شعراء کے نام ملتے ہیں وہیں محمد علی اثر کی تحقیق کے مطابق تین قدیم خاتون شعراء کے نام سامنے آئے ہیں

۱) اشرف النساء بیگم (۲) ذاکرہ بی اور (۳) لطف النساء امتیاز

ان سب میں امتیاؔز کو اس لیے شہرت حاصل ہے کہ یہ اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہے۔

مثنوی ''گلشن شعراء'' (۱۲۴۳ھ) سے قبل لطف النساء امتیاؔز کی ایک مشہور اور ضخیم مثنوی ''گلشن شعراء'' ہے جو ۸۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس سے ان کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

دکنی کی عام مثنویوں کی طرح اس کا آغاز بھی حمد، نعت اور منقبت سے ہوتا ہے اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے۔ امتیاؔز نے اس مثنوی میں اپنے نام کی صراحت اس طرح کی ہے:

ہے اس میں عشق کا آغاز و انجام
تب اس کا ''گلشن شعراء'' رکھے نام
کرے جو امتیاؔز اس مثنوی کا
وہ پاوے ذوق اس کے معنوی کا

اس مثنوی کا موضوع میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' سے تھوڑی سی مماثلت رکھتا ہے۔

مثنوی ''گلشن شعراء'' کا خلاصہ:

''گلشن شعراء'' کا ہیرو اور بادشاہ فیروز بخت ہے۔محل میں عیش وطرب کی محفل سجائی جاتی ہے لیکن یہ محفل بھی بادشاہ کو خوش نہیں کر پاتی اور وہ اپنے خیالات میں گم سم بیٹھا رہتا ہے۔ بادشاہ مسلسل تین دن اسی عالمِ پریشانی میں رہتا ہے۔ چوتھے دن تمام وزراء فکرمند ہوتے ہیں اور باہمی اتفاق سے یہ طئے پاتا ہے کہ روزانہ رات میں بادشاہ کو ایک داستان سنایا کریں گے اور چوتھے دن ہی بادشاہ بات کرنے پر آمادہ ہوتا ہے اور اپنی چپی اور خاموشی کی وجہ بتاتا ہے کہ اس کے تخت کا وارث کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ زبرجد شاہ کی لڑکی کے لیے شادی کا پیغام بھیجا جاتا ہے جو مسترد ہوتا ہے جس کے نتیجے میں دونوں بادشاہوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے اور پھر صلح ہونے پر شادی ہوجاتی ہے۔اس شادی سے بادشاہ کو ایک لڑکا تولد ہوا اور اس کا نام درشاہوار رکھا گیا۔نوجوانی کی عمر میں یہ لڑکا یعنی شہزادہ درشاہوار کسی کا عاشق ہوجاتا ہے اور شہزادی ''گوہر شب چراغ'' سے اس کی شادی کردی جاتی ہے۔قدیم اردو کی دیگر منظوم داستانوں کی طرح اس میں بھی مافوق الفطرت عناصر شامل ہیں۔

اس مثنوی کے سن تصنیف کے متعلق ڈاکٹر لئیق صلاح تحریر کرتی ہیں:

''ترقیمہ سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس مثنوی کی کتابت ۹/ محرم سنہ ۱۲۴۳ ھ کو مکمل ہوئی۔ لہذا یہ کہنا درست ہے کہ یہ مثنوی ۱۲۴۳ھ سے قبل لکھی گئی تھی اور اس کے کاتب سید محمد بدیع الزماں ہیں۔

بقول لئیق صلاح ''یہ مثنوی نواب حسین علی خاں کے پوتے میر یٰسین علی خاں کی ملکیت تھی جو اَب ناپید ہے۔''

راقمۃ الحروف کی معلومات کے مطابق یہ مثنوی نصیر الدین ہاشمی کے یہاں تھی پھر ان کے بعد ان کے صاحبزادے کے یہاں منتقل ہوئی۔ان کے صاحبزادے بھی اب اس دارِفانی سے کوچ کر چکے ہیں اس لیے اس کا مخطوطہ نہ دیکھ پانے کی بناء پر ہم اس مثنوی کا تفصیلی جائزہ لینے سے قاصر ہیں۔صرف چند اشعار نمونہء کلام کے طور پر پیش کرسکتے ہیں:

تو عشق حقیقی سے مدہوش ہے
شراب محبت سے بے ہوش ہے
عطا وہ کیے معرفت کا کلام
عطاء اللہ سچہ میرے مرشد کا نام
امین الدین اعلیٰ جو ہیں ان کے جد
وہ علمِ حقیقی کے ہیں مجتہد
جہاں تک زمیں ہے، وہاں تک امیں
ہیں سب اولیاء میں وہ مثلِ نگیں

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امتیاز شاہ عطاءاللہ کی مرید تھی،شاہ عطاءاللہ،امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کی اولاد اور خلفاء میں سے تھے۔ اپنے پیرومرشد سے محبت و عقیدت کا اظہار بڑی خوبی سے کیا ہے مگر یہ بات یہاں پرغور طلب ہے کہ اپنے معتقدات کے اعتبار سے امتیاز امامیہ مسلک

کی پابند تھی جس کا اظہار امتیاؔز نے اپنے دیوان میں مختلف مقامات پر کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ شاہ عطاء اللہ کی مرید تھی۔

نمونۂ کلام ''گلشن شعراء'' سے:

یہ قصے کو میرے تو مقبول کر
پڑھے اور سنے کوئی اہل ہنر
جو اس وہم میں دل نپٹ کٹ گیا
جو اک بی بی نے یہی مجھ سے کہا
جو لطف النساء سچ ہے تیرا ہی نام
ترے شعر کا شہرہ تا روم و شام

مثنوی ''سوانحی حالات'' (۱۲۱۲ھ سے قبل):

لطف النساء امتیاز کی دوسری مثنوی ''سوانحی حالات'' بھی ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس مثنوی میں ۲۱۹ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی امتیاز کی خودنوشت سوانح عمری پر مشتمل ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ صرف اندازِ بیان کے لحاظ سے مثنوی کہی جاسکتی ہے کیونکہ اس میں مثنوی کی روایت سے انحراف کیا گیا ہے۔ نہ اس میں حمد، نعت، منقبت ہے اور نہ ہی مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی موجود ہے۔ اسے ہم جدید مثنوی بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ مولانا الطاف حسین حالؔی نے جس صنف شاعری کو کارآمد اور فائدہ مند بتایا تھا جس میں روانی اور تسلسل کے ساتھ اپنے اور زمانے کے حالات موزوں کئے جاسکتے ہیں وہ مثنوی ہی ہے۔ اس مثنوی میں بھی امتیاؔز نے اپنے حالاتِ زندگی اور درد وغم کا اظہار کیا ہے۔ اگر ہم اس مثنوی کو ''تمنؔا کا مرثیہ اور امتیاؔز کے حالاتِ زندگی'' کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ نہایت ہی ماہرانہ انداز میں امتیاز نے اس مثنوی میں اپنے درد وغم کا اظہار کیا ہے۔

امتیاؔز نے اس مثنوی کی ابتداء ''ساقی نامہ'' کے انداز میں کی ہے جس میں اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی پراثر انداز میں کی گئی ہے۔ اشعار دیکھئے:

یہ موسم ہے اے ساقیٔ گلزار
یہ موسم ہے اے ساقیٔ نوبہار
یہ موسم ہے اے ساقیٔ ماہ رُو
یہ موسم ہے اے ساقیٔ مشک بُو
یہ موسم ہے اے ساقیٔ خوش ادا
یہ موسم ہے اے ساقیٔ دل رُبا

امتیاز کی یہ مثنوی ان کی خوشی وغم، تکلیف و راحت اور جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے۔ اس مثنوی میں امتیاؔز نے اپنے لاولد ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

نہ کوئی ہے خلیفہ نہ کوئی جانشیں
مشبہ بہ دو حرف نقش نگیں

کوئی ہمدم وہمراز نہ ہونے کا بھی گلہ کیا ہے اور اپنے غم کو بانٹنے کے لیے اس مثنوی کا سہارا لیا ہے:

نکوئی ہے مرا ہائے یہاں غم گسار
نکوئی ہے مرا اس جگہ ہم دیار
نہ وہ دلربا ہے نہ ہے کوئی رفیق
نہ ہم درد اس حال پر کوئی شفیق
نہ کوئی یار و غمخوار ہے یہاں مرا
نہ ہے پاس میرے نگار اب مرا

نہ ہے خویش یہاں اور نکوئی اقربا
ہوں بے چین میں دور ہے دلربا

امتیاؔز کے خاندان کے بارے میں ہماری معلومات میں تا حال کوئی اضافہ نہ ہوا۔ ان کی مثنوی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بڑے قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں:

وو غم باپ و ماں کا مجھے بے شمار
قبیلا ہی میرا تھا کچھ کم ہزار
تھے سب خویش غیور اور اقربا
غضب ناک عمدہ سبھی جابجا

جب امتیاز کی عمر ایک سال تین ماہ ہوئی تو ان کی ماں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کے والد نے ان سے منہ موڑ لیا۔ چنانچہ وہ کہتی ہیں کہ:

کہ اول جدائی کیا باپ و ماں
سوا برس کی بے شبہ تھی یہ جاں
تو پائی اسی عمر میں ماں نے فوت
دی خلعت یسیرے کی جب آ کے موت
موی تو ہوا ایک عالم پہ غم
مرے پر جدائی کا غم تھا ستم

والد نے اپنی کم سن دختر کو ایک شیعہ لاولد جوڑے کے حوالے کیا جنہوں نے بڑے لاڑ و پیار اور ناز و نعم سے ان کی پرورش کی۔ چند اشعار دیکھئے:

ہوا پرورش ہائے غیروں کے ہات
ہوئے اُن پودن عید شب شبِ برات
کیے پرورش وہ تو چاو کے سات
رکھے دائیاں نیک اور پاک ذات
و لیکن نہ میں دود کس کا پیوں
فراق جنی ماں سے ہر دم جھروں
کیے پرورش وہ جو پالی تھی ماں
زر و مال کیا تھا تصدق تھی جاں
نہ اولاد تھی ان کو اور آل تھی
وو ہوتے تھے صدقے یہہ دیکھ حال ہی

اُس دور کی روایت کے مطابق عمر کے پانچویں سال تسمیہ خوانی کی جاتی ہے (یہ روایت ابھی بھی بعض مسلم گھرانوں میں موجود ہے) امتیاز کی بھی تسمیہ خوانی کی گئی اور قابل اساتذہ کی نگرانی میں اس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا گیا:

ہوا جب آ کے سال پنجم
تو سونپے معلم جو تھے خُوش رقم
وو بسم اللہ جب دھوم سے میں پڑھا
ہوا اسم اللہ مرا رہ نُما
ہوئے چند روز اس کسب میں جو صرف
ووقسمت کے حاصل ہوئے جتنے حرف

امتیاؔز نے اس مثنوی میں لکھا ہے کہ لڑکپن ہی سے انہیں شعر و شاعری کا شوق تھا مگر اشعار موزوں کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے اورنگ آباد کے استادِ سخن اسد علی خاں تمنؔا سے ان کا عقد ہوا۔ اس شاعرانہ ماحول کا اثر ان پر بہت گہرا ہوا اور اس نے اشعار موزوں کرنے شروع کیے:

مقدر کا تھا جتا لکھا پڑھا
تکاور جوانی پہ جب جا چڑھا
لڑکپن سے یہہ شوق دل نے کیا
یہہ کچہ شعر و اشعار کا مشغلا
لیاقت تو کیا شعر کہنے کی تھی
ہوس یوں ہی چپ کہنے سننے کی تھی
فراست کدھر شعر فہمی کی ہائے
یہ ہو حوصلہ جس کا وہ کیا بنائے
سمجھ ناقصِ عقل نے یہہ شکل
کہ دردِ دل سوختہ جائے نکل
کرے نامہ اعمال کوئی سیاہ
کیا برس چھتیس اس میں تباہ

ooo

اس مثنوی میں جذبات نگاری اور سراپا نگاری نہایت خوب ہے۔ اپنے شوہر تمنؔا کی موت کے غم میں جذبات سے مغلوب ہوکر دل کی گہرائیوں سے وہ یوں شکوہ کرتی ہیں:

شتاب آ کے محفل میں ہو جلوہ گر
ترے بن تو ویراں ہے دل کا شہر
تجھے اس سفر میں ارے دل کے سنگ
مرا دردِ سر دیکھ اور زرد رنگ
مرے دل سے اب چین کھویا گیا
یہہ کیوں تخم غم آہ بویا گیا
ہزاروں درخت ہائے اگتے یہاں
ثمر غم سے پُر بار جھکتے ہیں ہاں
نہ برداشت ہے دل کو غم کی اے یار
شب و روز کب تک رہوں اشک بار
نکوئی پوچھتا حال میرے کو اب
یہہ شب تو کٹی آہ و فغاں میں سب
کہ راتوں کی بیداریاں ہیں مجھے
یہیں آہ و فریادیاں ہیں مجھے

ooo

ایک اور مقام پر امتیاؔز نے اپنے غم کی شدت کی انتہا کا اظہار اس طرح کیا ہے:

سینہ تری جفا سے معمور ہورہا ہے
ہر زخم دل میں ظالم ناسور ہورہا ہے

ooo

امتیاؔز نے اس مثنوی میں اپنے شوہر نامدار اسد علی خاں تمنؔا کا سراپا نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

ان اشعار کے مطالعے سے ہمیں تمنا کی وجاہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ امتیاؔز نے تمنؔا کی شعر گوئی اور استادِ سخن ہونے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

ہر یک بات اس کی کمند ہر گلو
یہہ جرأت کہاں کوئی کرے گفتگو
نہ طاقت کسی کو کچہ اپنا فن
کرے تاکہ اظہار اس میں سخن
کرے بند اس کو ہر یک بات پر
وو شاہِ سخن اس کا دے مات کر

کمیت شعر کا ہی تھا شہسوار
سخن کے اقالیم کا شہریار
کہ تھے شعر اشعار کے کل وہاں
ہزاروں ہیں رنگ کے وو تازہ بیاں

تمنا کی سفر کے دوران اچانک وارد ہونے والی موت نے امتیاز پر غموں کا پہاڑ توڑ دیا۔ اپنے درد وغم کا اظہار وہ نہایت دردمند انداز میں کرتی ہیں۔ بے انتہا غم و تکلیف میں بھی وہ مذہب کا دامن نہیں چھوڑتیں اور خود اپنے آپ کو صبر کرنے کی تلقین کرتی ہیں:

کیا ہے گا فرقان میں رب عالمیں
کہ تحقیق ان اللہ مع الصابریں
تو صابر صبر کرکے ہو امتیاز
کہ بندہ ہے جس کا وو بندہ نواز

اپنی شادی شدہ زندگی کے 36 سال بعد تمنا نے بیوگی کا زخم سہا ہے جس کا ذکر وہ اس طرح کرتی ہیں:

کیا شیشۂ دل کے تئیں پیس چور
اٹھا جوش کر دل میں غم کا وفور
مشقت برس ہائے چھتیس کی

انسان کی فطرت ہے کہ جب اسے کوئی غم نصیب ہوتا ہے اور پریشانی لاحق ہوتی ہے تو اسے ماضی کے وہ واقعات اور لمحات یاد آنے لگتے ہیں جس میں اس نے درد وغم سہا تھا۔ امتیاز نے اپنی مثنوی کی ابتداء تمنا کی موت اور اس پر غم واندوہ کی کیفیت سے کی ہے۔ پھر اس کے بعد اپنے بچپن کے حالات موزوں کئے ہیں اور وہ اپنی ان ساری پریشانیوں سے گھبرا کر آسمان سے شکوہ کرتی ہیں:

قیامت ہر اک آن ہوگی مجھے
ارے چرخِ کج رو کہوں کیا تجھے
ترے ہات کیا آیا اس جور سے
ذرا فکر کر دل میں کچھ غور سے
تب ہی سے عداوت پہ باندھا کمر
نہایت کو کیا ہے کہاں ہے خبر

مثنوی کے آخری اشعار میں یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ امتیاز کے اس دیوان میں کتنے ابیات ہیں اور یہ کس سنہ میں مکمل ہوا:

ہیں تعداد ابیات دیوان جو
ہوئے دو ہزار سات اور ایک سو
کیا سن ہے ہجری کو میں جب عیاں
ہوئے یک ہزار دو سو پہ بارا جاں

۱۲۱۲

مثنوی ''سوانحی حالات'' کے بغور مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ امتیاز کے یہاں روانی، ربط وضبط کمال کا ہے۔ وہ واقعات کا اظہار اس خوبصورتی سے کرتی ہیں کہ قاری ان کے جذبات سے مغموم ہونے لگتا ہے۔ ''کلیات امتیاز'' میں کئی غزلیں ایسی ہیں جن میں رنگارنگی اور مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے جو شگفتگی وتازگی کا احساس دلاتی ہیں۔ ان کے کلام میں شوخی و رنگینی کے ساتھ حزن و ملال بھی پایا جاتا ہے۔

O-O-O

محمد سرورلون
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اُردو، سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد
گچی باؤلی۔حیدرآباد 500046 (تلنگانہ)

عصمت چغتائی کے افسانوں میں مسائل نسواں کی بازگشت

عصمت چغتائی افسانوی ادب کی تاریخ کا ایک اہم نام ہے۔ یوں بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کی نفسیاتی اور جذباتی زندگیوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ان کا دائرہ محدود ضرور ہے لیکن ان کو فن افسانہ نگاری پر کمال قدرت حاصل ہے۔عصمت نے افسانہ نگاری کے ذریعے سماج اور معاشرے کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی ہے۔ان کے یہاں سماج کی ناہمواری، ذہنی غلامی، رجعت پسندی، توہم پرستی، مذہبی تعصب، ظلم واستحصال اور طبقاتی کشمکش کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ان کی تخلیقات میں جنسی اور نفسیاتی حقائق کا بے باکانہ تخلیقی اظہار ملتا ہے۔عصمت چغتائی کو مغربی مفکروں، دانشوروں اور ادیبوں سے گہری مناسبت تھی۔ان کی افسانہ نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''عصمت نے ہندوستان کے متوسط طبقے اور مسلمانوں کے شریف خاندانوں کی بھول بُھلیّوں کو جس جرأت اور بے باکی سے بے نقاب کیا ہے ان میں کوئی ان کا شریک نہیں۔ وہ ایک باغی ذہن، ایک شوخ عورت کی طاقت لسانی، ایک فنکار کی بے لاگ اور بے رحم نظر رکھتی ہے۔انہوں نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں، بوڑھی عورتوں، زن مرید شوہروں، جلتی بیویوں کی بڑی کامیاب مصوری کی ہے۔ان کے ہاں ڈرامائی کیفیت، قصہ پن، کردار نگاری، مکالموں کی نفاست اور خوبصورتی نمایاں ہیں۔مگر انہوں نے جو گھریلو با محاورہ جاندار اور رَچی ہوئی زبان استعمال کی ہے اس کی جدید افسانوی ادب میں کوئی اور نظیر نہیں''۔ (آل احمد سرور، تنقیدی اشارے، ص:36)

عصمت چغتائی ابتدا میں حجاب اسماعیل سے کافی متاثر تھیں۔انہوں نے اچھے رومانی افسانے بھی لکھے، مگر رشید جہاں سے ملاقات اور پھر علی گڑھ میں 'انگارے' کے مطالعے نے ان کے خیالات ونظریات میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی۔ بمبئی جاکر وہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہوگئیں۔آخری وقت تک اسی تحریک سے وابستہ رہیں۔انہوں نے اس تحریک کے سائے میں شاہکار افسانے لکھے۔

عورتوں کے مسائل پیش کرنے والے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو عصمت چغتائی کے افسانے سرفہرست نظر آئیں گے۔انہوں نے ان افسانوں میں بطور خاص مسائل نسواں، آزادی نسواں، حقوق نسواں اور ان کے مختلف مسائل وخواہشات کا بیان کثرت سے کیا ہے۔عورت ان کے تمام موضوعات کا

مرکز ومحور ہے۔اس بارے میں خود ایک انٹر یو میں کہتی ہیں:

''میں نے زیادہ تر عورتوں کے مسائل پر لکھا ہے۔ عورتیں جو چھابڑی لگاتی ہیں، پیشہ کرتی ہیں، فلم ایکٹرس جب ہم فلم بناتے ہیں تو ان میں کام کرنے کے لیے فلم ایکٹریس آتی تھیں، مجھے ان سے ان گنت کہانیاں ملیں۔''

(عصمت چغتائی انٹرویو از: طاہر مسعود، عصمت چغتائی شخصیت اور فن، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش، ص:645)

عصمت چغتائی کے متعلق اکثر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ ان کے موضوعات گھر کی چار دیواری تک ہی محدود رہتے ہیں، لیکن اگر اس چار دیواری کے اندر رہ کر یہاں کے مسئلوں پر گہری نظر ڈالی جائے تو یقیناً اس بات کا اندازہ ہوگا کہ دنیا میں پیدا ہونے والے انسانی زندگی سے جڑے مسائل کی جڑیں ان ہی مسائل سے ہو کر گزرتی ہیں۔ چار دیواری کے اندر پیدا ہونے والے مسائل ہی انسانی زندگی کے اہم مسائل ہیں۔ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے چار دیواری کے اندرونی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔عصمت چغتائی کے جن افسانوں میں عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے ان میں چوتھی کا جوڑا، بیکار، ننھی کی نانی، سونے کا انڈا، بھیڑیں، عشق پر زور نہیں، لحاف، چھوٹی آپا، بہو وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عصمت کے یہاں مختلف النوع موضوعات پر افسانے ملتے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نابالغ بچیوں کا نکاح، کم سنوں کی عصمت دری، جنسی اور ہم جنسی مسائل، غریبی، جوان لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ، امیر زادوں کی عیاشیوں کا شکار معصوم دوشیزائیں، زنا بالجبر، طبقاتی کشمکش اور انسان کی بے حسی جیسے متعدد موضوعات پر خامہ سرائی کی ہے۔

عصمت کا افسانہ ''چھوتی کا جوڑا'' عورتوں کے مسائل پر لکھا ہوا ایک اہم افسانہ ہے۔اس افسانہ میں عصمت چغتائی نے متوسط مسلمان گھرانوں کے انتہائی اہم مسئلے پر قلم اٹھایا ہے۔اس افسانے میں درد و کرب نمایاں ہے۔ہمارے سماج کے نچلے طبقے میں غریب ماں باپ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی شادی کا ہے۔ان کی شادی کے لیے لڑکا ڈھونڈنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔یہ مسئلہ خاص کر ان لوگوں کے لیے ہے جو غریب ہیں اور بیٹی کے لیے لمبا چوڑا جہیز نہیں دے سکتے۔بیٹیوں کی شادی کی فکر میں ماں باپ کا دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔وہ مسلسل کوشش کیے جاتے ہیں۔لیکن جب کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا تو ناچار قسمت کے مارے تھک ہار کر امید کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ادھر لڑکی بڑھتی عمر کے ساتھ احساس کمتری کا شکار ہوتی جاتی ہے اور دولہے کے انتظار میں اپنی جوانی کے حدود سے گزر جاتی ہے۔اسے اپنا مستقبل تاریک اور ڈراؤنے خواب کی طرح خوف زدہ کرتا رہتا ہے۔ماں باپ کا بڑھاپا دن بہ دن انہیں قبر تک لے جانے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ان کے صبر اور استقلال کا باندھ ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔وہ اس بے رحم سچائی سے منھ چھپا کر کسی غیبی طاقت سے مدد کی امید لگائے بیٹھے رہتے ہیں، لیکن کسی کو کیا پتا کہ زندگی کس قدر بے رحم ہے خاص طور سے غربت کے مارے ماں باپ کی جو بیٹیوں کے والدین بھی ہیں۔

یہ کہانی ایک ایسے خاندان کی ہے جس کی سرپرست بی اماں ہیں جن کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ان کے انتقال

کے بعد گھر کی کفالت کی ذمہ داری بی اماں کی ہے۔ان کی دو جوان لڑکیاں کبریٰ اور حمیدہ ہیں۔بی اماں کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ اور مقصد کبریٰ کی شادی ہے۔کبریٰ ڈری، سہمی، خاموش طبیعت کی معمولی شکل وصورت والی لڑکی ہے۔والد کے انتقال کے بعد اس کے لیے شادی کا کوئی پیغام نہ آیا۔اس کے انتظار میں اس کی عمر تیزی سے گزر رہی تھی۔امیدیں ختم ہو رہی تھیں۔تبھی بی اماں کے منجھلے بھائی کا لڑکا راحت پولس کی ٹریننگ کے لیے ان کے گھر میں قیام کرنے کے لیے آتا ہے تو ان کی امیدیں اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔وہ اپنا زیور بیچ کر گھر ٹھیک کرواتی ہیں اور راحت کے رہنے کا انتظام بھی کرتی ہیں:

''اسی وقت اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منھ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشہ سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لیے ٹول لا دیں۔باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔کمرہ تو چٹّا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی۔اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکّر کھا کر دوہری ہو گئی۔ساری رات کروٹیں بدلتی گزری۔ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے، دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔''

(عصمت چغتائی، دو ہاتھ، افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ص:116)

بی امّاں تو اس قدر گھبرائی ہوئی تھیں کہ مانو راحت ان کے گھر بارات لے کر آ رہا ہو۔وہ خوش تھیں کہ اللہ نے ان کی دعا سن لی۔ایسا لگتا ہے جیسے دروازے پر بارات کھڑی ہو۔حمیدہ نے اپنی ماں اور آپا کی دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے فجر کی نماز میں سر بسجود ہو کر دعائیں مانگی۔

''اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میرے آپا کا نصیبہ کھل جائے۔میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی''۔ (ایضا:115)

یہ ایک چھوٹی بہن کی اپنی بڑی بہن کے لیے سچّے دل سے نکلی ہوئی دعا تھی۔کبریٰ اپنے جذبات کو ظاہر نہ ہونے دیتی تھی کیوں کہ وہ شرم وحیا کی ماری لڑکی تھی اور زبان کھولنے سے قاصر تھی۔لیکن دل ہی دل میں وہ خوش تھی۔کب سے اپنے دولہے کا انتظار کر رہی تھی۔اب انتظار کی گھڑی ختم ہونے کا وقت تھا۔راحت آیا' سیویوں اور گھی ٹپکتے پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلا گیا۔ راحت کی روز خوب خاطر مدارات ہوتی۔اس کی خاطر تواضع کے لیے وہ لوگ روکھا سوکھا کھا کر روز راحت کو مزہ دار اور اچھے سے اچھا کھانا کھلاتیں۔ان سب میں بی اماں کا چھوٹا موٹا جو زیور موجود تھا سب بک گیا، مگر مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ان کی اس غربت کے حالات کا بیان عصمت نے اس طرح کیا ہے:

''جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور ہاتھوں کی دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے' کوفتے، بھنا پلاؤ مہکتے۔خود روکھا سوکھا سانوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔''

(ایضاً:118)

لیکن اسے خدمت کا صلہ کچھ یوں ملتا ہے کہ ایک

دن اچانک راحت یہ کہہ کر اپنا رخت سفر باندھ لیتا ہے کہ اس کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔ کبریٰ دق کے مرض میں مبتلاء ہوجاتی اور آہستہ آہستہ یہ مرض اسے مکمل اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس طرح وہ بدنصیب اور نامراد کبریٰ جس کا ہاتھ تھامنے کوئی مرد اس لیے تیار نہ تھا کہ وہ جہیز میں ٹھوس کڑے یا بھرت پایوں کا پلنگ بھی نہیں لاسکتی تھی' آخر کار موت اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اور وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیتی ہے۔ وہ ماں جس نے بڑے ارمانوں سے چوتھی کے خوبصورت جوڑے تیار کیے تھے' صبر وتحمل سے بیٹی کو کفن پہناتی ہے۔ یہ کہانی محض کبریٰ کی ماں کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی سماج کی ہر گھر کی کہانی ہے۔ لہٰذا یہ افسانہ متوسط طبقے میں لڑکی کی بدنصیبی نہیں بلکہ پوری نسل کا المیہ ہے۔ خواجہ احمد عباس کے مطابق:

''نچلے متوسط طبقے کی یہ کہانی چوتھی کا جوڑا کو ایک نشانی، ایک سمبل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سمبل ان لڑکیوں کا جو اپنی خاندانی غربت کی وجہ سے بن بیاہی رہ جاتی ہیں۔ مگر اتنی فن کارانہ خوبصورتی سے یہ کہانی بیان کی گئی ہے' ایسی خوبصورت اور آسان الفاظ میں کہ آپ کو یہ پتا بھی نہیں چلتا ہے کہ کتنے بڑے المیہ کو بیان کررہی ہے۔''

(عصمت چغتائی: نقد کی کسوٹی پر، جمیل اختر، 2001، ص:351)

عورتوں کے سماجی اور معاشی مسائل پر مبنی ان کا افسانہ ''بیکار'' بھی سماج کا آئینہ ہے۔ جس میں انہوں نے ملازمت کرنے والی خواتین کی زندگی میں درپیش مسائل کو پیش کیا ہے۔ اس افسانہ میں ہاجرہ اپنے شوہر باقر میاں کی نوکری چلی جانے کے بعد ایک ایک کر کے اپنے ساری زیور بیچ دیتی ہے۔ وہ گھر کی پریشانیوں اور بگڑتے حالات کو سنبھالنے کے لیے اسکول میں ملازمت کرتی ہے۔ مگر باقر میاں کے دوست ہاجرہ کے باہر نکلنے پر طعنہ کستے ہیں اور اس کے کردار پر بھی انگلی اٹھاتے ہیں اور ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی بازارو عورت ہو۔ دوسری طرف اسکول کے حکام اس کی معاشی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے زیادہ کام لیتے ہیں اور پھر گھر میں اس کا شوہر جس کی ذہنی نشو ونما روایتی اخلاقیات کی پروردہ تھی، اس پر نہ صرف شک کرتا ہے بلکہ ہاتھ بھی اٹھاتا ہے۔ آخر کار اچانک باقر میاں کی موت ہوجاتی ہے۔ جس کا ذمہ دار بھی ہاجرہ کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

''باقر میاں کی ماں کی آواز۔۔۔ اُٹھ نصیبوں جلی۔ تیرا ارمان پورا ہوگیا۔۔۔ ہائے ڈائن میرے لال کو کھا گئی۔''

(اُردو افسانہ روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، ص:334)

عصمت چغتائی نے اس کہانی میں دکھایا ہے کہ سماج کبھی کبھی عورتوں کے ساتھ اس قدر ظالمانہ رویہ اختیار کرلیتا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے گھر، اپنی زندگی یا اپنے خاندان کے لیے کچھ کرنا چاہے تو اس کی محنت کی قدر نہ کر کے اس کے لیے راستہ مزید تنگ کردیتا ہے۔ جہاں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔

افسانہ ''ننھی کی نانی'' عصمت کا مسائل نسواں کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ محلے ٹولے میں رہنے والی غریب مظلوم، بوڑھی کی داستان حیات ہے۔ اس میں انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح دل میں درد کا

طوفان چھپا ہونے کے باوجود جینے کا بہانہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔
ننھی کی نانی افسانے کے آغاز میں عصمت لکھتی ہیں:

''ننھی کی نانی کے ماں باپ کا نام تو اللہ جانے کیا تھا۔ لوگوں نے کبھی انہیں اس نام سے یاد نہ کیا' لونڈیاں کے نام سے پکاری گئیں۔ پھر کچھ دنوں ''پترے کی بہو کہلائیں پھر بسم اللہ کی ماں کے نام سے یاد کی جانے لگیں اور جب بسم اللہ جاپے کے اندر ہی ننھی کو چھوڑ کر چل بسی تو ننھی کی نانی کے نام سے آخری دم تک پہچانی گئیں۔''

(عصمت چغتائی، سوری ممی، افسانہ، ننھی کی نانی، 1992، ص:57)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عورت کی زندگی تو اپنی ہے لیکن دوسروں کے نام سے پہچانی جارہی ہے۔ وہ ساری عمر اپنی بدنصیبی پر پٹتی رہی مگر اس کی آہ و بکا نہ خدا نے سنا اور نہ ہی کسی انسان نے کان دھرے۔ اس نے یوں ہی روتے روتے زندگی گذار دی، پہلے شوہر کھویا پھر بیٹی اور بڑھاپے میں نواسی سے ہاتھ دھویا۔ ہر غم کو آخری غم سمجھتی لیکن جب تک موت نہ آ گئی' کوئی غم آخری نہ ہوا۔

ننھی کی نانی زندہ رہنے کے لیے گھروں میں اوپر کا کام کرتی لگتی ہے۔ وہ پہلے ڈپٹی صاحب کے یہاں کام کرتی تھی، مگر ڈپٹی صاحب کی حیوانیت سے بے خبر ننھی کو بھی ان کے یہاں کام پر لگا دیتی ہیں۔ ڈپٹی صاحب انسان کی شکل میں بھیڑیا نکلے۔ ایک دن گھر میں اکیلا دیکھ کر ڈپٹی صاحب اسے اپنی شہوانیت کا شکار بنا لیتے ہیں۔ غریب بے سہارا نانی ڈر کر خاموش رہ جاتی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لوگ ننھی کا استعمال کر کے سماج کی ایسی کھائی میں پھینک دیتے ہیں جہاں سے واپس آنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک غریب بے سہارا لڑکی سماج کے حیوانیت پسندانہ رسوم و رواج پر مبنی استحصال کا شکار ہو کر ذلّت میں دھنستی چلی جاتی ہے۔

مثلاً افسانہ 'سونے کا انڈا' میں سماج کی کڑوی سچائی کو پیش کیا گیا ہے۔ عورتوں کو مساوی حقوق حاصل ہو جانے کے بعد بھی لڑکیوں کی پیدائش پر گھر میں ماتم کا ماحول ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی بندو میاں کے گھر پر تیسری مرتبہ لڑکی پیدا ہو جانے پر لڑکے کی آس لگائے سب کے چہرے اُتر جاتے ہیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ لڑکوں کو طنزیہ طور پر سونے کا انڈا کہا ہے جو بڑے ہو کر نوکری کرتے ہیں اور دلہن کے ساتھ جہیز میں بے شمار دولت لاتے ہیں جبکہ بیٹیوں کو اس لیے بوجھ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے لیے لڑکا تلاش کرنے کے ساتھ شادی کے لیے جہیز جمع کرنا پڑتا ہے۔ تب بندو کی بیوی سوچتی ہے کہ میں ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں میری بیٹیوں کو سماجی مقام مل سکے۔

''اس کا جی چاہا کہ اپنے تینوں کلیجے کے ٹکڑوں کو اٹھا کر اس گھر سے، اس گلی سے، اس شہر سے بلکہ اس دنیا سے بھاگ جائے۔ وہاں جہاں اس کے جگر گوشے دولت کے ترازو میں نہ تولے جائیں۔۔ جہاں عورت کی تخلیق عذاب جان نہ ہو۔ جہاں اولاد سے والدین محبت کریں اولاد سمجھ کر، زرجا گیر سمجھ کر نہیں۔'' (عصمت چغتائی، چھوئی موئی، کتب پبلشرز لمیٹیڈ' بمبئی، ص:179)

افسانہ'' چھوٹی آپا'' میں عورت کے تعلق سے اس حقیقت کو موضوع بنایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو

ایک بے جان متی کی مورت سمجھا جاتا ہے، جس کے پاس نہ دل ہے اور نہ کوئی جذبہ، عشق و محبت کے جذبے صرف مرد کے پاس ہوتے ہیں اور اسی کو سب اختیار حاصل ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد تو محبتیں کھلے عام کرتا ہے لیکن عورت کے لیے محبت کرنا اتنا معیوب سمجھا جاتا ہے کہ اسے اپنے محبت کی قربانی دینی پڑتی ہے اور ان کو معاشرے میں بہت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

افسانہ ''آدھی عورت آدھا خواب'' میں عصمت نے ایسے مسئلے پر سوال اٹھایا ہے کہ اگر مرد مر جائے تو عورت بیوہ ہو جاتی ہے لیکن اگر بیوی مرتی ہے تو مرد کے لیے ایسا کوئی نام دینے کا رواج سماج میں کیوں نہیں ہے مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''عورت بیوہ ہوجاتی ہے تو اس کی چوڑیاں توڑ دیتے ہیں، مرد کی عینک یا حقہ توڑنے کا بھی خیال نہ آیا۔ بیوہ لباس بھی تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ رنگا دوپٹا پہنے یا ہاتھوں میں چوڑیاں ڈال لے تو لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں۔ مرد ہی سوٹ بوٹ، اچکن، انگرکھا ڈالے پھرتا ہے، کیسی بے رحمی ہے کہ دکھاوے کو بھی سوگ نہ کرتا۔''

عصمت چغتائی نے غربت کی چکی میں پستی عورتوں کی مجبوریوں اور محرومیوں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ افسانہ ''بھیڑیں'' میں یہ حقیقت سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس معاشرے میں کہیں کہیں عورتوں کو جانور سے بھی زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کہانی میں مرکزی کردار میگی نام کی ایک نچلے طبقے کی عیسائی لڑکی ہے جس کو اس کے والدین نے کام پر لگا دیا ہے۔ وہ شہر ممبئی میں رہتی ہے جہاں وہ کام کر کے پیسہ جمع کرتی ہے تا کہ اپنے لیے شادی کا انتظام کر سکے، کیوں کہ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو اسے مانا بن کر رہنا پڑتا جو ساری عمر کنواری رہ کر دوسروں کے بچوں کی پرورش کرتی ہیں، لیکن شادی سے قبل اس کے دلہے کی ایک حادثے میں موت ہو جاتی ہے، جو میگی کے لیے بہت بڑا المیہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی موت کے بعد وہ دوسرے مرد سے شادی کرتی ہے جہاں اس کو غربت کی وجہ سے اسقاط حمل جیسے ناجائز کام کو انجام دینا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اس کے پاس نہ وقت ہے اور نہ پیسہ۔ عصمت نے اس روح فرسا حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں عورت کو کس حد تک ذلیل اور حقیر سمجھا جاتا ہے کہ والدین سے لے شوہر اور شوہر سے لے افراد سماج کوئی بھی اس کی قدر و قیمت سے واقف ہی نہیں ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں بیوہ عورتوں کے مسائل اور معاشرے میں ان کے ساتھ افسوس ناک سلوک کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ''عشق پر زور نہیں'' میں انہوں نے 'خلیفن بوا' کے کردار کے ذریعہ ہمارے معاشرے میں ایسی عورتوں کی حالتِ زار کو پیش کیا ہے جو بیوگی کی وجہ سے اپنوں میں بھی بیگانگی کی زندگی گزارتی ہیں۔ نہ سماج اسے عزت دیتا ہے اور نہ ہی اولاد۔ یہاں تک کہ اولاد جس پر اپنی ممتا نچھاور کر کے پرورش کرتی ہے، وہ خود تو عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں، مگر بوڑھی ماں کے لیے ان کے پاس کوئی گنجائش نہیں۔

افسانہ ''چھوئی موئی'' ایک ایسی بہو کی کہانی ہے جو اپنی زندگی سے بے زار اور مستقبل کی طرف سے خوف زدہ دکھائی دیتی ہے۔ اولاد سے محرومی اس کی نامراد زندگی کی بنیاد

بن کر ایک ناسور بن جاتا ہے ۔ ہندوستانی معاشرے میں دوسرے سماجی المیوں کی طرح ، اولاد کا نہ ہونا بھی عورت کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے ۔اس افسانے میں عصمت نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کی مظلومیت اور خانگی زندگی کی تصویر بڑے دُکھ سے دکھائی ہے کہ:

''اور وہاں خیر غائب تھی۔۔۔اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے باجے خزاں برسانے لگے۔''

(عصمت چغتا ئی، چھوئی موئی، کتب پبلشرز لمیٹیڈ بمبئی، ص:230)

عصمت چغتائی نے نہ صرف معاشرے کے کمزور طبقہ کے استحصال کے خلاف آواز اُٹھائی بلکہ انہوں نے معاشرے کے بالخصوص نوابوں اور اُمراء کی طرز زندگی اور عورتوں کے حوالے سے ان کے رویوں کو بھی اپنے افسانوں میں بے نقاب کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کا سب سے اہم افسانہ ''لحاف'' ہے ۔اس افسانہ میں جاگیردارانہ نظام میں جنم لینے والے ایسے المیے کو پیش کیا گیا ہے جو عمر رسیدہ جاگیر دار اور غریب نوجوان خاتون کی بے جوڑ شادی کا نتیجہ ہے۔اس کہانی میں عصمت نے اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ عورت کو بھی انصاف چاہیے ۔مرد اپنی دلچسپیوں میں کھو کر جن عورتوں کو بے جان مورتیاں سمجھ کر نا انصافی کے جال میں جکڑ دیتے ہیں تو وہ بھی زندگی گذارنے اور آسودگی حاصل کرنے کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تلاش کر لیتی ہیں ۔یہ ذریعے کتنے ہی گھناونے مکروہ اور غیر فطری کیوں نہ ہوں۔بقول مجنوں گورکھ پوری:

''لحاف میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایک نوجوان اور شریف عورت ایک ہیجڑے کے پلّے باندھ دی جائے تو وہ اپنی زندگی کس طرح گزارتی ہے۔''

(جمیل اختر،عصمت نقد کی کسوٹی پر،ص:273)

افسانہ ''نیند'' میں دکھایا گیا ہے کہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ کس طرح اپنی بیویوں کا استعمال کر کے مال و مفادات حاصل کرتے ہیں۔عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے موضوعات و واقعات اور کردار نہ صرف حقیقی زندگی سے لئے ہیں، بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افسانوں میں سماجی و معاشرتی المیے کی عکاسی کرنے کے لئے انہوں نے مختلف طریقوں کا استعمال بھی کیا ہے۔

الغرض انہوں نے اپنی تخلیقات میں عورتوں سے متعلق تمام مسائل پر بڑے موثر انداز میں اظہار کیا ہے۔ان کے یہاں عورتوں کے مسائل کی سچی اور حقیقی تصویریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔انہوں نے زندگی کو جس انداز میں دیکھا اُسی انداز میں پیش بھی کیا اور عورت کا نمایاں روپ دکھانے کی کوشش کی۔ان کی تحریروں میں عورت کا استحصال اور اس پر ہونے والے ظلم کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصمت چغتائی اُردو کی واحد ایسی خواتین فکشن نگار ہیں جنھوں نے عورتوں کے مسائل کو بڑی مضبوطی کے ساتھ پیش کیا اور عورت کو صرف حسن و عشق اور محبت و رومان کی چیز نہیں سمجھا بلکہ اس کی خصوصیات کو بیان کر کے اس کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی کوشش کی تا کہ اسے سماج میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

O-O-O

ڈاکٹرعزیز سہیل
حیدرآباد

عصر حاضر میں بچوں کا ادب اور بچوں کے مسائل
(ایک جائزہ)

بچے کسی بھی قوم کا عظیم سرمایہ ہوتے ہیں۔ایک بچہ اپنے والدین کے لئے دل کا سرور آنکھ کی ٹھنڈک ہوتا ہے۔ خاندان کو آگے بڑھانے اور والدین کا نام روشن کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی اچھی پرورش اور تعلیم و تربیت اسے مستقبل کا ذمہ دار شہری اور قوم و ملک کا معمار بناتی ہے۔اس لئے بچوں کی مناسب تربیت ہر زمانے میں اہم ضرورت سمجھی گئی اور اس جانب توجہ دی گئی۔ بچوں کی تربیت میں گھر' والدین' اساتذہ اور سماج اہم رول ادا کرتے ہیں۔اور تربیت اولاد کے ذرائع کے طور پر ادب کو بھی اہم آلے کے طور پر استعمال کیا گیا اور بچوں کے لئے ہمارے شعراء اور ادیبوں نے صالح ادب کی تشکیل کی ہے۔دور حاضر میں بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے حالانکہ ماضی میں بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی کیونکہ بچوں کے ادب کا مقصد بچوں کی ذہنی تربیت، اصلاح اور کردار سازی ہوتا ہے۔

بچوں کے ادب میں نظمیں، گیت، اخلاقی کہانیاں، تاریخی کہانیاں، مذہبی کہانیاں' پریوں کی کہانیاں' اخلاقی مضامین، سیرت، ڈرامے، مزاحیہ مضامین اور لوریاں وغیرہ شامل ہیں۔غرض ہر تخلیق جو بچوں کے لئے لکھی کی جائے وہ بچوں کا ادب کہلاتی ہے۔

نظیر اکبرآبادی کو اُردو ادب کا اولین عوامی شاعر کہا جاتا ہے جنہوں نے بچوں کے ادب پر بہت ساری اہم نظمیں لکھیں جن میں قابل ذکر ریچھ کا بچہ، ہرنی کا بچہ، گلہری کا بچہ، ایام طفلی، تل کے لڈو وغیرہ ہیں۔مرزا غالبؔ، ڈپٹی نظیر احمدؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، پیارے لعل آشوب، علامہ اقبالؔ و دیگر شعراء وادبا نے بچوں کے لیے نظموں اور نثری تخلیقات سے بچوں کے ادب کو مالا مال کیا۔اس کے بعد کے دور میں منشی پریم چند، خواجہ حسن نظامی، اسمٰعیل میرٹھی، عظیم بیگ چغتائی، ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچوں کیلئے نظمیں اور کہانیاں لکھیں جن کی مدد سے اُردو میں بچوں کے ادب سے متعلق ایک عظیم سرمایہ جمع ہوا۔

ہندوستان میں بچوں سے متعلق کئی اہم رسائل شائع ہوتے رہے ہیں جن میں قابل ذکر ماہنامہ امنگ، ماہنامہ پیام تعلیم، ماہنامہ ہلال، ماہنامہ نور، ماہنامہ اچھا ساتھی و دیگر شامل ہیں۔قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان نئی دہلی جو کہ حکومت ہند کا ادارہ ہے اور جس کا مقصد اُردو زبان و ادب کو فروغ دینا ہے اس ادارہ نے 2013ء میں اپنے معروف رسالہ اُردو دنیا کا خصوصی شمارہ بچوں کے ادب سے متعلق شائع کیا تھا جس سے بچوں کے ادب سے متعلق کافی اہم معلومات سامنے آئی ہیں' یہ خصوصی شمارہ بچوں کے ادب سے متعلق ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ قومی کونسل نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے ماہنامہ اُردو دنیا کی طرز پر'' ماہنامہ بچوں کی دنیا'' ادبی رسالہ بچوں کیلئے اگست 2013ء سے جاری کیا ہے۔ یکم اگست کو ایک تقریب میں وزیر مملکت ہند جتندر پرساد نے اس شمارے کا رسم اجراء انجام دیا۔اس موقع پر انہوں نے کہا کہ'' میں ماہنامہ بچوں کی دنیا کی اجرائی پر قومی کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام اور ان کی ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ جنہوں نے صحیح وقت میں صحیح فیصلہ لیا اور بچوں کیلئے قومی سطح کا معیاری اور دل کش رسالہ شائع کیا ہے تا کہ بچوں کی ذہنی و علمی نشونما ہو اور نئی نسل اردو ادب کے عظیم ذخیرے اور نئی معلومات سے مستفید ہو۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے اس ترقیاتی دور میں بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے، بچوں کا ادب بہت کم تخلیق ہو پارہا ہے' البتہ بچوں کیلئے ادبی رسالے مسلسل شائع ہورہے ہیں۔دور حاضر میں کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، موبائیل، ٹیب پر بچے گیمس کھیلنے میں مشغول ہیں۔جس سے بچوں کے اندر چڑچڑاہٹ اور غیر اخلاقی کیفیت پیدا ہورہی ہے۔ٹکنالوجی کا استعمال ہونا چاہئے مگر ٹکنالوجی ہم پر حائل ہورہی ہے' یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ ایسے میں والدین کا فریضہ ہونا چاہئے کہ اپنی اولاد کو اُردو زبان وادب سے واقف کروائیں۔ ساتھ ہی اُردو لٹریچر اپنے بچوں کو مطالعہ کیلئے فراہم کریں تا کہ ان کے اخلاق وآداب سنور سکیں۔

کہانی کہنا اور سننا انسان کی فطرت میں شامل ہے ہر انسان کی زندگی کی بھی ایک کہانی ہوتی ہے اور ہر گذرے ہوئے واقعات بھی کہانی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔کہانی کا مقصد انبساط اور تفریح بھی ہے۔ ماضی میں جب کہ تفریح اور فرصت کے اوقات کو گذارنے کے ذرائع محدود تھے۔کہانی نے یہ کام کافی عرصے تک انجام دیا۔ پہلے کہانی کتاب کے ذریعے پیش ہوتی تھی۔آج یہی کہانی میڈیا کے ذرائع ٹیلی ویژن' فلم اور انٹرنیٹ کے ذریعے پیش ہورہی ہے۔کہانی کی پیشکشی کا ایک مقصد اصلاح بھی ہوسکتا ہے۔اور یہ اصلاح کا کام اگر بچوں کے لئے ہو تو بہت اچھی بات ہے۔ایک ایسے دور میں جب کہ بچوں کے مشاغل کمپیوٹر اور ویڈیو گیمس، انٹرنیٹ تک وسیع ہوگئے ہیں۔ انہیں کہانی کے ذریعے تربیت دینا بھی اردو زبان میں اب ایک انہونی بات سمجھی جارہی ہے۔لیکن آج بھی جن علاقوں میں اُردو کا چلن عام ہے اور ادبی رسائل اور اخبارات نکل رہے ہیں وہاں بچوں کا ادب خوب لکھا جارہا ہے۔اور اس کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔

بچوں کے رسائل کے معیار سے متعلق جناب ایس۔ایم۔رحمان لکھتے ہیں:

''حالیہ دنوں بچوں کے لیے اُردو زبان میں بہت ساری کتابیں لکھی گئیں لیکن مائل خیر آبادی کے معیار والی کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی، نظم ہو یا نثر بچوں کے ادب پر سنجیدگی اور یکسوئی سے کوئی کام نہیں ہو سکا۔ ایک زمانے میں بچوں کے رسالوں میں ماہنامہ نور، ھلال، اچھا ساتھی، پیام تعلیم، جیسے رسالوں سے بچوں کی ذہن سازی کا کام بخوبی انجام دیا جاتا رہا۔ ان رسالوں کے ذریعہ بچوں کی دینی، اخلاقی، ذہنی وعلمی تربیت کا کام بھی خوب ہوا، لیکن اب ان رسالوں کا زور مستقل ٹوٹتا جا رہا ہے، کیونکہ خانگی اداروں کے ذریعہ شائع کیے جانے والے یہ رسالے گیٹ اپ، ڈیزائننگ، اور عمدہ طباعت کے معاملے میں ان رسالوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے ہیں، جو سرکاری اداروں کی سرپرستی میں شائع ہو رہے ہیں۔ ماہنامہ امنگ، سہ ماہی سائنس کی دنیا، جیسے رسالے سیکولر رنگ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان رسالوں کے ذریعہ بچوں کو صرف معلومات اور تفریح فراہم کی جاتی ہے، البتہ ان کی دینی و اخلاقی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا جاتا۔'' (ایس۔ ایم۔ رحمان، سابق صدر حلقہ ایس آئی او مہاراشٹر، ماخوذ اُردو ویب)

عصر حاضر میں بچوں کے ادب پر بہت کم لکھا جا رہا ہے۔ البتہ ہمارے ملک ہندوستان میں ملک کے مختلف علاقوں سے بچوں کیلئے ادبی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ دور حاضر میں کمپیوٹر ٹکنالوجی اور مختلف گیمس نے بچوں کو مشغول کر رکھا ہے' ایسے میں والدین کا فریضہ ہونا چاہئے کہ اپنی اولاد کو اُردو زبان وادب سے واقف کروائیں۔ ساتھ ہی اردو لٹریچر اپنے بچوں کو فراہم کریں تاکہ ان کے اخلاق وآداب سنوار سکیں۔

بچوں کے ادب کے مسائل سے متعلق پروفیسر ابن کنول دہلی یونیورسٹی رقمطراز ہیں:

''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل ہے اور سنجیدہ تخلیق کار جب چاہے بچوں کے لئے کہانیاں یا نظمیں تخلیق کر سکتا ہے لیکن یہ محض خوش فہمی ہے بچوں کا ادب تخلیق کرنا انتہائی مشکل عمل ہے اس لئے بہت کم تخلیق کار اس میدان میں جوہر دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت بچوں کی پسند اور ان کی سطح پر اترنا پڑتا ہے۔ اپنی سوچ کو بچوں کی سوچ سے ہم آہنگ کرنے کے بعد بچوں کیلئے ادب تخلیق کیا جا سکتا ہے۔'' (اردو دنیا، نومبر 2012ء ص 25)

ضلع نظام آباد ریاست تلنگانہ کا ایک تاریخی تہذیبی و ادبی مرکز ہے۔ یہاں اُردو کی مختلف تنظیمیں ہر آئے دن اُردو زبان وادب کے فروغ کیلئے مختلف سرگرمیاں انجام دیتی آرہی ہیں۔ ساتھ ہی اردو صحافت کا کردار بھی نمایاں ہے۔ یہاں سے 6 روزنامے، 10 سے زائد ہفتہ وار اخبارات اور تقریباً 10 اُردو رسائل شائع ہوتے ہیں جن میں بچوں کے ادب سے متعلق ماہنامہ التوحید (ایس آئی او) کی جانب سے اور بچوں کا ساتھی شیخاپور ہائی اسکول کی جانب سے شائع ہوتے آرہے ہیں۔ راقم الحروف کو نظام آباد سے بچوں کیلئے اُردو کا پہلا

رسالہ شائع کرنے اور ماہنامہ التوحید کے بانی ایڈیٹر کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ یہ کوشش اب سے تقریباً 17 سال قبل کی گئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضلع نظام آباد اُردو زبان وادب کی ترقی میں پیش پیش ہے۔ اور یہاں بچوں کے ادب کے لئے بھی خاطر خواہ کام ہورہا ہے۔ اور اس کے اچھے نتائج سامنے آرہے ہیں۔ ماہنامہ التوحید کے آغاز کے بعد صرف ضلع نظام آباد میں اسکول کی سطح پر اس کے خریداروں کی تعداد تقریبا 5 ہزار تک جا پہنچی تھی۔ اُردو کے عام اور مقبول رسائل کی پہنچ اسکول تک نہیں ہو پاتی۔ ضرورت ہے کہ ہر ضلع میں اسکول کی سطح پر کوئی رسالہ ضرور پہنچایا جائے جس سے بچوں کے اندر مطالعہ کا ذوق پیدا ہو اور ان کی اخلاقی تربیت کا سامان ہو۔

فاروق سید ''بچوں کے لئے اُردو اخبارات و رسائل'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ ''اُردو کے نیم مردہ جسم کے لئے تازہ خون اور تازہ خون کے لئے نئے ذہنوں کی ضرورت ہے۔ یہ نئے ذہن ہماری موجودہ نسل ہے۔ موجودہ نسل کو تندرست وتوانا بنانے کے لئے ان کی ذہنی آبیاری کی ضرورت ہے۔ ذہنی آبیاری یا نشوونما کا کام بچوں کے رسالے بہت ذمہ داری کے ساتھ ادا کررہے ہیں لیکن بچوں کے رسالوں تک بچوں کی رسائی کی سب سے بڑی رُکاوٹ والدین اور اساتذہ ہیں۔ اسکول کا انتظامیہ بچوں کے والدین' طالب علموں کے اساتذہ کے نزدیک پڑھائی کا مطلب صرف اور صرف نصابی کتابوں کی تعلیم تک ہی محدود ہے۔ ان کی نظر میں غیر درسی کتابیں بالخصوص رسائل کا مطالعہ تضیع اوقات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے دسویں اور بارہویں میں سب سے زیادہ مارکس حاصل کرنے والے روبوٹ بن جائیں۔ جن کے سینے میں دل کی جگہ مارکس کی مشین فٹ کردیں اور جو الف سے اللہ ب سے بسم اللہ سے پڑھائی کے بجائے الف سے ایک، ب سے بیس، پ سے پچاس کی گنتی سیکھیں جو زندگی بھر گنتی کے اُلٹ پھیر میں اُلجھے رہیں۔''

بچوں کے وہ رسائل جن کی خدمات اردو ادب کے سلسلہ میں کافی اہمیت کی حامل اور ناقابل فراموش ہیں ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

ماہنامہ پیامِ تعلیم: ویکیپیڈیا پر پیامِ تعلیم سے متعلق جو تفصیلات لکھی گئی ہیں اس کے مطابق ہندوستان کے صدر مقام نئی دہلی میں قائم جامعہ ملیہ اسلامیہ کی زیرِ سرپرستی کام کرنے والے مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کی زیرنگرانی شائع ہونے والا بچوں کا ماہنامہ ہے۔ 'پیامِ تعلیم 1926ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی تحریک پر مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے جاری ہوا تھا، اُس وقت بچوں کی نظمیں تو لکھی جارہی تھیں، نثر پر توجہ نہیں تھی۔ 'پیامِ تعلیم' کے اجراء سے بچوں کے لیے نثری تخلیقات لکھی گئیں اور بچوں کی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ بطورِ حوصلہ افزائی اُن کی تحریروں کی اشاعت بھی ہوئی۔ 'پیامِ تعلیم' کے ایڈیٹروں میں ڈاکٹر عابد حسین خاں، حسین خان ندوی، غلام ربانی تاباں، شاہد علی خاں اور لکھنے والوں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر، ڈاکٹر مشیر الحق، خلیق انجم، رشید حسن خاں

کے نام شامل ہیں۔

ادارہ الحسنات کے رسائل: آزادی کے بعد بچوں کے ادب کو فروغ دینے میں ادارہ الحسنات نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس ادارہ کا قیام 1947ء میں عمل میں آیا اس ادارہ کے بانی محترم ابوسلیم محمد عبدالحئ ہے۔اس ادارہ نے اردو ادب بالخصوص بچوں کے ادب کے فروغ میں لازوال خدمات انجام دی ہے، اس ادارہ نے نئی نسل کی اخلاقی تربیت اور تعمیری ادب کے فروغ کیے لئے ہر عمر اور جنس کے اعتبار سے رسائل شائع کئے ہیں بچوں کے لئے ''بچوں کا ماہنامہ ہلال'' نوعمروں کے لیے ماہنامہ نور ،خواتین کے لئے ماہنامہ بتول اور عام قارئین کے لئے الحسنات اور ہادی وغیرہ۔

ماہنامہ امنگ: دہلی سے شائع ہونے والا بچوں کا مقبول عام رسالہ ہے۔اس رسالہ کو دہلی اردو اکیڈیمی نے 1987ء میں جاری کیا۔ یہ بچوں کا دل پسند اور معیاری رسالہ ہے۔اس رسالہ میں بچوں کی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف کالمس کے تحت مضامین ،کامکس ،کہانیاں، شاعری، پسندیدہ اشعار، لطیفے، دنیا رنگ برنگی ،کوئز، عام معلومات کو شامل کیا جاتا ہے۔اس رسالہ کے مدیر ایس ایم علی اور نگراں ڈاکٹر ماجد دیوبندی ہیں۔اس رسالہ کی خوبی یہ ہے کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے' ساتھ ہی اس کے مشمولات کافی اہم معیاری اور بچوں کی دلچسپی کے پیش نظر شامل کئے جاتے ہیں۔

ماہنامہ بچوں کی دنیا: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے ''ماہنامہ بچوں کی دنیا'' اگست 2013ء سے جاری کیا ہے اس ماہنامہ کے مدیر پروفیسر ارتضی کریم اور نائب مدیر ڈاکٹر عبدالحئ ہیں۔بچوں کی دنیا نئی دہلی کے شماروں کے مشمولات میں مدیر کا خط، مضامین، نظمیں، ،فوٹو فیچر، کہانیاں، با تصویر کہانیاں، کامکس، منظوم کہانیاں، قسط وار ناول، سائنس، کھیل اور کھلاڑی اور ذہنی آزمائش ، ننھے فنکار جیسے موضوعات پر تخلیقات شامل کی جاتی ہیں ۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ کافی معلوماتی اور بہترین ہے اور اس کو مزید بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔اس رسالہ کا پیپر اور گرافکس دور حاضر کے تقاضوں سے موافقت رکھتا ہے۔ رسالہ کا سائز درمیانی ہے۔چونکہ یہ سرکاری رسالہ ہے' اس لئے اس کی قیمت بھی صرف 10 روپئے رکھی گئی ہے۔

اُردو ماہنامہ گل بوٹے: یہ بچوں کا رسالہ ہے' 1996ء سے سید فاروق کی زیر ادارت ممبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالہ کی اشاعت کے 21 سال مکمل ہو چکے ہیں ۔ ابتداء میں اس کی اشاعت 250 کاپی تھی جو اب بڑھ کر 25000 تک جا پہنچی ہے۔اس رسالہ کے آغاز سے اب تک کے سفر میں ادارہ نے مسلسل جدوجہد اور معیار کے ساتھ اس رسالہ کی اشاعت عمل میں لائی ہے۔ یہ رسالہ بچوں میں کافی مقبول ہے۔ یہ رسالہ ریاست مہاراشٹرا کے بچوں کی پہلی پسند ہے اب اس رسالہ کی رسائی نہ صرف ہندوستان بلکہ خلیج کے ممالک تک جا پہنچی ہے۔

ان رسائل کے علاوہ ماہنامہ سائنس دہلی، ماہنامہ فنکار نو حیدرآباد، بچوں کی نرالی دنیا دہلی، کھلونا

ودیگر نے بچوں کے ادب کے فروغ میں اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہے۔آج اُردو کے بہت سے میعاری رسائل ملک کے مختلف مقامات سے شائع ہورہے ہیں ضرورت ہے کہ ان رسائل کی رسائی کو اسکولی بچوں تک ممکن بنائے تاکہ بچے ان رسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے ادب واخلاق کوفروغ دیں اور اپنے مذہب سے وابستہ رہتے ہوئے سماج اور معاشرے کی خدمات کا کام بحسن خوبی انجام دیں۔محمد شرف الدین ساحل کے چند اشعار پیش کرتے ہوئے اپنی تحریر کو اختتام پر پہنچاتا ہوں کہ:

پیارے بچو تم ایک کام کرو
اپنی نیکی سے پیدا نام کرو
با ادب با نصیب ہوتا ہے
تم بزرگوں کا احترام کرو
بے ادب بے نصیب ہوتا ہے
اس لیے سب کو تم سلام کرو
تم سے ناراض ہو اگر کوئی
اپنی باتوں سے اس کو رام کرو
اپنے دشمن سے خود گلے مل کر
سارے شکوے گلے تمام کرو
جس کسی سے ملو تو ہنس کے ملو
نرم لہجے میں پھر کلام کرو
راہ میں جب ملے کوئی مجبور
چھوڑ کر اپنا اس کا کام کرو
بیٹھنے سے جہاں ملے نیکی
ایسی مجلس کا اہتمام کرو
خوب محنت کرو پڑھائی میں
بس یہی کام صبح و شام کرو
اپنے کردار کے سہارے تم
علم کا شوق سب میں عام کرو
علم ہی لا زوال دولت ہے
مشتہر بس یہی پیام کرو

O-O-O

امام غزالیؒ فرماتے ہیں

☆ اگر رزق عقل اور دانشوری سے ملتا تو جانور بے وقوف بھوکے مرجاتے۔

☆ انسان کی تمام پریشانیوں کی وجہ مقدر سے زیادہ چاہنا' وقت سے پہلے چاہنا' قناعت پسندی کی کمی ہے۔

☆ دنیا نصیب سے ملتی ہے اور آخرت محنت سے' لیکن لوگ محنت دنیا کے لئے اور آخرت کو نصیب پر چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ توقعات کی کہانی کا انجام صرف دکھ ہوتے ہیں۔

☆ 'غصہ' کسی دوسرے کی غلطی کی سزا خود کو دینا ہے۔

☆ جو غلطی کر نہیں سکتا' وہ فرشتہ ہے۔جو غلطی کر کے اس پر ڈٹ جائے وہ شیطان ہے اور جو غلطی کے بعد توبہ کر لے وہ انسان ہے۔

☆ جو دوست مشکل وقت میں کام نہ آئے اس سے بچو' کیونکہ وہ تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے۔

oOo

ڈاکٹر شیخ عمران
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اُردو
وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز
ناگپور، مہاراشٹرا۔

ادب اطفال اور علامہ اقبالؔ

ادب اطفال سے مراد وہ ادب جس میں بچوں کے موضوعات، مسائل اور معاملات پر اظہار خیال کیا گیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا ایک کافی مشکل امر ہے۔ چونکہ ادب اطفال پر وہی ادیب یا تخلیق کار لکھ سکتا ہے جسے بچوں کی نفسیات، فطرت اور ان کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ یا علم ہو۔ تب جا کر کوئی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ ادب اطفال کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں بلکہ یہ وہ ادب ہے جو کسی بھی ملک کی زبان کے لیے بے حد ضروری اور بنیادی ہے۔ اس ادب میں بچوں کی مثبت ذہن سازی کی جاسکتی ہے۔ سماجی ثقافتی، تاریخی اخلاقی مسائل کو آسانی سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ آگے یہ علم بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھا ہوا ادب ہر دور کے بچوں کے لیے چاہے وہ کسی شکل میں ہو کسی نہ کسی طرح فائدہ مند ہوتا ہے۔ کیونکہ بچوں کی نفسیات میں یکسانیت ہوتی ہے جو زیادہ فرق پیدا نہیں کرتی۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماضی کا ادب اطفال حال کے ادب اطفال کو توانا کرسکتا ہے اور اپنے معیار کو بلند بھی کرسکتا ہے۔ اُردو ادب میں دیگر موضوعات کی طرح ادب اطفال کو بھی ایک خاص مقصد کے تحت لکھا گیا۔ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بڑے موثر پیرائے میں اس ادب کا استعمال کیا ہے۔ جیسے حضرت امیر خسرو، نظیر اکبر آبادی، اقبال، کرشن چندر، پریم چند، اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی وغیرہ۔ عالمی حیثیت کی ترقی یافتہ زبانوں میں ادب اطفال کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُردو ادب میں ادب اطفال کی ابتداء کے متعلق ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

''اُردو میں بچوں کے ادب کی ابتداء امیر خسرو سے مانی جاتی ہے۔ ان کی کتاب ''خالق باری'' حمد ہے جو نظم میں ہے۔ اور نصاب میں شامل رہی ہے۔ حالانکہ اس میں بچوں کے ادب کی خصوصیت بہت کم نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی زبان سہل ہے۔ خالق الباری سے متاثر ہوکر بہت سی کتابیں بعد میں لکھی گئیں''

اُردو ادب میں ادب اطفال کو فروغ دینے میں جن شاعروں اور ادیبوں نے نمایاں مقام حاصل کیا ہے اُن میں ایک اہم نام علامہ اقبال کا ہے۔ اُردو کے ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر کی حیثیت سے اقبال کو موسوم کیا جاتا ہے۔ اُردو غزل اور نظم کے سرمائے میں اقبال نے جو بیش

بہا اضافے کیے وہ نا قابل فراموش ہیں۔آج بھی آپ کی شاعری کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ادب اطفال میں بھی آپ نے بہترین خدمات انجام دی ہیں۔اقبال کو بنیادی طور پر اہل اُردو ایک فلسفی شاعر تسلیم کرتے ہیں لیکن جب ہم ان کی قومی وملی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو اقبال ایک محبّ وطن قوم پرست شاعر دکھائی دیتے ہیں۔اسی طرح اقبال کی بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو اقبال ہمیں بچوں کے شاعر نظر آتے ہیں۔اقبال اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حالی کی اصلاح پسندی کو جاری رکھتے ہوئے اپنی قوم کے بچوں کی اصلاح کے لیے کئی سبق آموز نظمیں لکھیں۔شاعری میں آپ نے داغ دہلوی سے اصلاح لی تھی۔حالی کے پیشرو تھے۔تاہم اقبال سے قبل کسی شاعر نے خاص بچوں کے لیے اتنی کثیر تعداد میں شاہکار نظمیں نہیں لکھیں تھی۔حقیقت میں یہ اقبال کی شاعری کا ایک حیرت انگیز پہلو ہے۔اقبال نے اپنا پیغام عوام تک پہچانے کے لیے شاعری کا سہارا لیا۔وہ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ بچے قوم وملت کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ان کی مناسب تعلیم وتربیت ضروری ہے۔ساتھ ہی ان میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے۔اقبال نے بچوں کے لیے جتنی بھی شاہکار نظمیں لکھیں ان میں زیادہ تر نظموں میں تمثیل نگاری کی ٹکنیک کا استعمال کیا ہے۔اُنہوں نے اپنی نظموں میں چھوٹے چھوٹے قصے اور سیدھی سادھی زبان استعمال کرتے ہوئے بچوں کی کردار سازی کے لیے بڑی نصیحت آموز باتیں کہیں ہیں۔

بقول جگن ناتھ آزاد:

''اپنے ملک وقوم کے بچوں کے مستقبل سے اقبال کو بڑی دلچسپی تھی۔بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے اُنہوں نے ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر قوم بچوں کی بہبودی کی طرف متوجہ ہوسکتی ہے۔اور ایسی دلکش نظمیں بھی کہیں جنہیں بچے شوق سے پڑھ کر ان میں بیان کی ہوئی تعلیمات پر عمل کر کے اپنے ملک ہی کے نہیں بلکہ دنیا کے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔'' (اقبال کی کہانی: جگن ناتھ آزاد، ترقی اُردو بورڈ، دہلی، ص: ۱)

اقبال نے اپنی نظموں کے وسیلے سے ہندوستانی بچوں کو ترقی یافتہ نظریات سے روشناس کرایا۔ادب اطفال پر نظمیں تحریر کرنے سے قبل اقبال نے ''بچوں کی تربیت'' کے عنوان سے اپنے بالکل عبوری دور میں ایک مضمون قلم بند کیا تھا اور وہی سے آپ نے ادب اطفال کے میدان میں قدم رکھا۔اقبال کو بچوں کی تعلیم وتربیت کا خیال تھا اور بچوں کی نفسیات پر آپ کی گہری نظر تھی۔علامہ اقبال نے بچوں کے لیے طبع زاد، اصلاحی، اخلاقی اور وطنی نظمیں لکھیں۔ بچوں کے لیے آپ نے جو بھی لکھا وہ ایک جوہری کی نظر میں جواہر ریزوں سے کم نہیں۔ادب اطفال میں آپ کی خدمات سے متاثر ہوکر عبدالقوی اس طرح لکھتے ہیں:

''وہ بچے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے جس سے وہ ایسا انسان بن سکے جو خدا سے آگاہ

ہو۔صداقت شعار ہو،حریت پسند ہو،غرور تکبر کی لعنت سے پاک ہو،محسن شناس ہو،خدمت گزار ہو،غریبوں کا مددگار ہو،کمزوروں کا حامی ہو،وطن پرست ہو،انسان دوست ہو،برائیوں سے پاک ہو اور پیکر عمل ہو۔'' (بچوں کے اقبال۔ص:۳۸)

کئی انگریزی نظمیں جو بچوں کے ادب پر مبنی تھیں، علامہ اقبال نے اُن کا اُردو ترجمہ کیا جیسے ''ایک مکڑا اور مکھی''، ''ایک پہاڑ اور گلہری''، ''ایک پرندہ اور جگنو'' ''بچہ کی دعا''، ''ایک گائے اور بکری'' اُن کی شاہکار نظمیں ہیں۔ان نظموں کے علاوہ اقبال کی فلسفیانہ نظمیں'' عہد طفلی''، ''بچہ اور شاعر''، ''طفل شیرخوار''، ''ماں کا خواب''، وغیرہ نظمیں اس بات کی شاہد ہیں کہ اقبال ابتداء ہی سے بچوں کے بارے میں غور وفکر کرتے رہتے تھے۔ آپ کی تخلیق کردہ بہت سی نظموں کو اُردو نصاب میں بھی شامل کیا گیا ہے تاکہ اقبال کا پیغام بچوں تک راست پہنچ سکے اور بچے ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرسکیں۔ ان کے علاوہ دیگر نظموں میں ''ترانہ ہندی''، ''ہندوستان کا قومی ترانہ'' (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) قابل ذکر ہیں۔ یہ ایسی نظمیں ہیں جو بچوں میں اپنے وطن کی محبت کا احساس تہذیبی وثقافتی دلکشی کے ساتھ پیدا کرتی ہیں۔اپنی تمام نظموں میں اقبال نے بچوں کے لیے بڑی نصیحت آموز باتیں کہی ہیں۔نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' میں اقبال نے یہ سبق دیا کہ خدا کی مخلوقات کو اپنے بڑے یا چھوٹے ہونے پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔ ہر مخلوق میں اللہ تعالی نے کچھ خوبیاں تو کچھ خامیاں رکھی ہیں۔اس نظم میں پہاڑ اور گلہری کی گفتگو کا منظر پیش کیا گیا ہے:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جاکے ڈوب مر
ذرا سی چیز ہے اس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ یہ شعور کیا کہنا

''ایک گائے اور بکری'' اس نظم میں یہ سبق دیا ہے کہ انسان کو ہر حال میں اپنی موجودہ حالت پر خوش وخرم رہ کر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔اور زیادہ کی حرص نہیں کرنی چاہیے کیونکہ قسمت کا لکھا تو اُسے مل کر ہی رہے گا:

گائے سن کر یہ بات شرمائی
آدمی کے گلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے
اور کچھ سوچ کر کہا اُس نے
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

نظم ''ہمدردی'' میں ایک جگنو کے ذریعہ ایک بلبل کو راستہ دکھانے کا قصہ بیان کیا ہے۔نظم کے آخری حصے میں اقبال لکھتے ہیں:

اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

نظم ''پرندے کی فریاد'' میں پرندے کی التجا کا جو منظر اقبال

نے بیان کیا وہ قابل تعریف ہے۔اس نظم میں غلامی کی صعوبتوں کو جذباتی انداز میں پیش کیا گیا ہے:

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی

ادب اطفال اور علامہ اقبالؔ!

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

''بچے کی دعا'' یہ نظم علامہ اقبال کی ایک شاہکار نظم ہے۔اس نظم کا ہر شعر کمال درجہ کا ہے۔اس نظم کے ابتدائی حصے میں اقبال نے دعا کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کی تکمیل میں خدا کا محتاج ہوتا ہے۔اس لیے انسان کو صرف خدا ہی سے اپنی ضروریات کی تکمیل کی دعا کرنی چاہیے:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب!
مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

الغرض ادب اطفال پر لکھی گئی اقبال کی تمام نظموں کو اُردو کے عالمی ادب میں شاہکار نظموں کا درجہ حاصل ہے۔یہ نظمیں زبان اسلوب اور موضوعات کے اعتبار سے اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ادب اطفال کے ذخیرہ کو وسیع کرنے میں اقبال نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بچوں کے لیے کہی گئی اقبال کی یہ نظمیں اپنے اندر اخلاقی تعلیمات کا بیش قیمت خزانہ رکھتی ہیں۔اور ہم اُن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

O-O-O

اقوال زرین

☆ بہترین کام وہ ہے جو اعتدال سے کیا جائے۔
☆ فکر نصف بڑھاپا ہے۔
☆ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
☆ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔
☆ اپنے آپ کو فتح کرنا سب سے بڑی فتح ہے۔
☆ افضل انسان وہ ہے جو اپنی اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔
☆ زندگی کا سب سے مشکل کام اپنے علم پر عمل کرنا ہے۔
☆ اپنی خوراک پاکیزہ و حلال کرو، تمہاری دعا قبول ہوگی۔
☆ جب کہو تو عدل و انصاف کی بات کہو
☆ اچھا لباس پہن کر گنوار اور جاہل بھی مہذب کہلاتے ہیں، مہذب نہیں ہو سکتے۔
☆ علم مرد کا زیور ہے۔
☆ لوگوں کو اچھی بات کہو۔
☆ کوئی بھی قوم قبیلہ یا برادری اچھی یا بری نہیں ہوتی، ہر انسان اپنی ذات کی حد تک اچھا یا برا ہوتا ہے۔
☆ انسان کو ہمیشہ اپنے سے نیچے دیکھنا چاہیے، اوپر دیکھنے سے احساسِ کمتری کا احساس ہوتا ہے۔

oOo

پروفیسر حبیب ضیاء

307 ماہرہ بلاک
گارڈن ٹاورز، منصاحب ٹینک، حیدرآباد (تلنگانہ)

انداز اپنا اپنا

کچھ کاج کر کے دوست احباب کو بلانے کا رواج زمانہ دراز سے چلا آرہا ہے۔تقریب کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو ،لوگ اپنا بجٹ ناپ تول کر دیکھ لیتے ہیں۔ پھر بہت محتاط طریقے سے مدعوئین کی فہرست تیار کرتے ہیں، لیکن بعض گھرانوں میں یہ صرف احتیاط نہیں ہوتی۔اس کے پیچھے ان کے ذہن میں کھلبلانے والے جراثیم کام کرتے ہیں ۔یعنی بعض خواتین جان بوجھ کر کچھ ایسے منصوبے بناتی ہیں کہ چند کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔یہ عموماً نازک رشتوں یعنی نند بھاوج وغیرہ کے درمیان ہوتا ہے۔ یوں ہی کہاوت مشہور ہے ہی ،نند کا ناطہ سرو الے کا کانٹا۔

دعوت دینا اور قبول کرنا بہت بڑا آرٹ ہے، دعوت دینے اور قبول کرنے کا ہر ایک کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ذرا سی چوک ہو جائے تو ہر دو کے لئے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ایک صاحبہ نے اپنی قریبی رشتہ داروں میں سے پچاس افراد کے لئے دعوت کا اہتمام کیا۔ فہرست بناتے وقت انہیں بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ ایک قریبی رشتہ دار کے بارہ بچے تھے۔ماں باپ کو ملا کر چودہ۔کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اس کا حل یوں نکالا۔فون پر کہہ دیا۔ ہمارے پاس ایک چھوٹی سی تقریب ہے۔آپ اپنے کسی دو بچوں کو ساتھ لائیں۔بارہ بچے پیدا کر کے زندگی بھر کے پچھتاوے میں تو پڑ ہی گئے تھے۔اب ہر اس لمحے سے چوکنے رہتے جس میں پچھتاوے کا ذرہ برابر بھی شائبہ محسوس کرتے۔کسی دو بچوں کی دعوت نے ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔کچھ دیر کے لئے دماغ ماؤف سا ہو گیا۔پھر ان کے ذہن نے اپنا کام کر دکھایا۔ گویا میزبان کو چیلنج کیا۔گانے کے مقابلے کی طرح انہوں نے دعوت سے دس دن قبل گھر میں کھانے کے مقابلے کا اہتمام کیا۔پوری ٹیم کو بٹھا کر کھانے کی رفتار اور مقدار کو نوٹ کرنا شروع کیا۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ بڑے بچے اس بازی میں ہار گئے۔دس اور بارہ سال کے بچوں کا انتخاب کیا۔ دسترخوان کو لوٹنے کے سارے گُر انہیں اچھی طرح سمجھا کر دعوت میں لے گئے۔ان بچوں نے باپ کی لاج رکھ لی۔کھانے کا اتنا شاندار مظاہرہ کیا کہ محدود دعوت میں

واقعی کھانا کم پڑ گیا۔ دسترخوان کے ان شیروں نے باقی دس بہن بھائیوں کی کمی پوری کرتے ہوئے میزبان کو ایک طرح سے سبق بھی سکھا دیا۔

سلام کرنے ،ایک دوسرے کو Wish کرنے کے بھی ہر گھرانے کے اپنے اپنے الگ انداز ہوتے ہیں۔ بڑوں کا احترام مختلف طریقوں سے جتایا جاتا ہے۔ کہیں پیر چھو کر تو کہیں جھک کر سلام کر کے۔ پیر چھونے کے بھی کئی انداز ہیں۔ پورا ہاتھ پاؤں کو لگنا۔ پاؤں پر لگانے سے پہلے ہی ہٹا لینا۔ بزرگ کے پاؤں کی طرف ہاتھ بڑھا کر ہاتھ کھینچ لینا۔ اور آخری صورت ان کے پیٹ تک ہاتھ بڑھا کر اپنے پیٹ کی جانب کھینچ لینا۔ ایک دفعہ کسی محفل میں ایک لڑکی ہمارے قریب آ کر جھکی ہم نے فوراً پاؤں پیچھے ہٹا لئے۔ اس نے پھر یہی عمل کیا۔ ہم نے سوچا شاید کوئی انگوٹھی وغیرہ گر گئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈ رہی ہے۔ تیسری بار ہماری عقل نے کام کیا۔ وہ تو بیچاری ہمارے پاؤں چھو کر ہمیں عزت دینا چاہتی تھی۔ ہم اس انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ اب یہ تہذیب ختم ہوتی جا رہی ہے۔ بعض گھرانوں میں یہ رواج باقی ہے۔

فیشن کی مار کھائے گھرانوں میں ایک دوسرے کے گالوں کو چھیڑا جاتا ہے۔ بڑے چھوٹوں کو اور برابر والی خواتین ایک دوسرے کے گالوں کو چومتی ہیں۔ یہ نظارے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ لپ اسٹک کے نکل جانے کے ڈر سے جو بوسہ لیا جاتا ہے اُسے اَدھر پپّی کا نام دیا جا سکتا ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بوسہ وصول کرنے والی خاتون تیزی سے پیچھے سرک جاتی ہیں کیونکہ لینے والی کے منہ میں زردہ اور قوام کا پان بھرا ہوتا ہے۔ وہ ہوائی بوسہ لے کر دوسری جانب متوجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح کے ہوائی بوسے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ نئی نسل میں سلام کرنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ جن گھرانوں میں جھک کر آداب عرض کرنے کا رواج تھا اب سر کی ذرا سی جنبش کافی سمجھی جاتی ہے۔ آگے یہ ہوگا کہ سر ساکت رہے گا' صرف آنکھوں کو جنبش دی جائے گی۔ بدلتی تہذیب کے اس سلام کو ہم دور ہی سے سلام کرتے ہیں۔

ہندوستان میں شادی بیاہ اور دوسرے مواقع پر اہتمام سے بنائی جانے والی تقاریب میں مشترکہ تہذیب کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ بعض لوگ تو ان رسوم میں اتنے ڈوبے ہوئے ہیں کہ تیر کر نکلنا چاہیں تب بھی نکل نہیں سکتے۔ کچھ دور آ کر پھر ڈبکیاں لگانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب شادی بیاہ کے مختلف رسوم کے سخت مخالف ہیں۔ ان کا یہ انداز ہمیں بہت اچھا لگا۔ ایسی تقاریب کا وہ بائیکاٹ کرتے ہیں۔ بیوی بچوں پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔ قول و فعل کے اس قدر پابند کہ بیوی بچوں کو انہوں نے دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر ایسی تقاریب میں وہ جائیں گے تو بچوں کو عاق اور بیوی کو طلاق دے دیں گے۔ آج کل یہ تو مردانگی کی شان بن گیا ہے۔ بہر حال ہمیں خوشی ہوئی کہ ہر خاندان میں ایک سپوت تو ایسا ہے جو بے جا رسموں کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔ جب ان کے گھر شادی کی

تقریب ہوئی تو ان کا رنگ ہی کچھ اور تھا ۔نرالے انداز تھے ۔تمام رسمیں ہوئیں ۔بوڑھی نانی ساس ڈھول بجا بجا کر گا رہی تھیں ایسی آواز کو عام زبان میں پھٹا ڈھول کہتے ہیں ۔رات کے ۲ بجے ،بینڈ باجے اور پٹاخوں کے شور سے پولیس بھی آ گئی ۔

اپنے اپنے انداز کی بات آ ہی گئی ہے تو چلتے چلتے آپ کو شادی کی ایک تقریب میں لے چلتے ہیں ۔ہم نے دیکھا کہ ایک صاحبہ کھلے ، بکھرے بکھرے بالوں سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں ۔اونچی ایڑھی کے سنڈل بھی پہلی دفعہ پہنی تھی' مانگ کرلائی تھیں' چلنے میں تعکف کے ساتھ تعکیف بھی تھی ۔ہم نے سوچا دولہا یا دولہن میں سے کسی ایک کی قریبی رشتہ دار ہوگی ،عدیم الفرصتی کے باعث کنگھی کرنے سے بال رہ گئے ۔یقین جانئے ! یہ مصروفیت نہیں ان کا خاص اسٹائیل تھا ۔بیوٹی پارلر والا گھرانہ نہیں' صرف دیکھا دیکھی انہوں نے چولھا پھونکا تھا ۔

کسی کی عیادت کرنے اس کے گھر جانا بڑی فضیلت بتائی گئی ہے ۔ہم میں سے کوئی اس بات سے بخوبی واقف ہیں ۔مزاج پُرسی کے لئے جائیں تو مریض کے لئے میوہ وغیرہ لے جانا ، اُس سے زیادہ گفتگو نہ کرنا ، دیر تک اس کمرے میں نہ بیٹھنا یہ اور بہت سی باتیں ، آداب ہیں جن کی پابندی سب کے لازم ہے ۔ایک صاحبہ کو ہم نے دیکھا ، مریضہ کے کمرے میں آئیں' ذرا سی دیر میں انہوں نے چہرے پر نقلی تفکرات کے آثار پیدا کر ڈالے ۔ مریضہ کو تجسس سے دیکھتی رہیں ۔چند لمحوں تک منہ نہیں کھولا اور جب کھولا تو مریضہ کے سامنے تیماردار سے کہنے لگیں ۔کب سے بیمار ہیں ؟ ایک دم کمزور نظر آ رہی ہیں' حالت رہ گئی ! ہم نے غور کیا ، ماضی کو ٹٹولا ۔پورے بیس سال کے بعد وہ اس گھر میں آئی تھیں ۔خود ان کی حالت اتنی ابتر تھی گویا پھونک ماریں تو اڑ جانے کا ڈر تھا ۔

گذشتہ چند ماہ قبل ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس گئے ۔نمبر تیسرا ہی تھا مگر باری آنے کا نام نہیں تھا ۔بہت دیر سے ایک جوڑا ڈاکٹر کے کمرے میں تھا ۔ڈاکٹر کی آواز کم ، مریضہ کی زیادہ آ رہی تھی ۔ذرا سا دروازہ کھلا تو ان کے لاڈ آمیز یہ مکالمے سنائی دیئے ۔ڈاکٹر صاحب کچھ کیجئے ، میرے کپڑے تنگ ہوگئے ہیں میں موٹی ہوگئی ہوں ۔ بہ خدا ہم نے آج تک کسی مریضہ کو ڈاکٹر سے ایسا بیہودہ لاڈ کرتے نہیں دیکھا تھا ۔ڈاکٹر کیا خاک سمجھا تا انہیں کہ پیزا ، برگر کھانا کم کریں ، گھر کا کام کاج خود کریں ۔پانی اٹھ کر پئیں ،معصوم ملازمہ کو کچھ آرام دیں ۔

قربان جایئے اِس انداز گفتگو پر ،لعنت بھیجئے اُس شوہر پر جو بیوی کے اس طرز کلام پر وارے نیارے جا رہا تھا ۔

O-O-O

شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں

☆ زندگی کی درازی کا راز صبر میں پوشیدہ ہے ۔

☆ موتی اگر کیچڑ میں گر جائے تو بھی قیمتی ہے اور گرد اگر آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بے قیمت ہے ۔

☆ جو شخص دوسروں کے غم سے بے غم ہے' آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ۔

شہانہ اقبال
حیدرآباد

بنتِ حوا کہاں جائے.....؟

اللہ نے عورت اور مرد کا رشتہ بڑا انوکھا اور حسین بنایا ہے، خوبصورت اور لطیف احساسات سے گوندھے اس آپسی تعلق کا کوئی جواب نہیں، دونوں کے درمیان ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو کشاں کشاں انہیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ کر لیجاتی ہے، گو کہ ان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو۔

ابتداء میں مرد عورت کو اپنی جاں نثار کرنے والے انداز میں پھولوں کی رانی، بہاروں کی ملکہ، جانِ بہار، کلیوں کا نکھار، شبنم کی ٹھنڈک، شفق کی لالی یا بارش کی پہلی پھوار اور جانے کن کن القاب کا محور گردانتا ہے، اپنی محبت کے سارے خزانے اس پر لٹانے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی ایک ایک ادا پر مر مٹنے کو تیار رہتا ہے، اس کے وجود کو تاحیات آنکھوں میں بسائے رکھنے کا عہد کرتا ہے، دل کی ہر دھڑکن کو اس کے نام سے منسوب کرتا ہے۔

بے چاری عورت مرد کے سارے دعوؤں پر یقین کر کے امربیل کی مانند اپنے آپ کو اس کے سپرد کئے ہرے بھرے پتوں، انوکھی کونپلوں سے اُگتی نرم و نازک کلیوں اور خوشبو لٹاتے پھولوں کی مدد سے سجا سنوار کر پیڑ کے تنے کو زینت بخشتی ہے، اور پھر نئی نئی شاخوں کو سینچ کر مضبوط ڈالیوں کا روپ دے کر اپنے وجود کو ختم کر لیتی ہے۔

بڑھتی عمر کے ساتھ سفاک اور بے مروت مرد اُسے چھوڑ کر، اس کی وفا اور ایثار کو مجروح کر کے، اس کے حسین جذبات اور نازک احساسات کے ساتھ اُسے بھی سرد خانوں میں منجمد کئے، کسی نئی تتلی کے تعاقب میں دوڑنے لگتا ہے، تتلی تو خیر کیا ہاتھ آتی خود اوندھے منہ گر کر اپنے چہرے اور ہاتھ پیر کو زخمی کر لیتا ہے، ایسے میں سرد خانے سے نکلی عورت ایک بار پھر اپنی محبت اور خدمت کی حرارت سے اپنے مجازی خدا کو نیا جیون دیتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہاتھ آئی تتلی کے کچے رنگ بہت جلد اُڑ کر بے رنگ ہو جاتے ہیں، تب اُسے اپنی وفادار بیوی کے پکّے رنگ یاد آتے ہیں اور جب لوٹ کے بدّھو گھر کو آتے ہیں تو اس کے انتظار میں پلکیں بچھائے اپنی بیوی کو منتظر پاتے ہیں جو انہیں اپنے پیار و محبت کے وسیع اور پاکیزہ آنچل میں سمیٹ کر از سرِ نو پورے تحفظ کے ساتھ زندگی کے سفر میں ساتھ چلنے کے قابل بناتی ہے، چند ہی

دنوں میں شرمندگی اور کھلی ہار کا طوق گلے سے نکال پھینکتے ہیں اور پھر بہت جلد بیوی پر دھونس جمانا اور اس پر ظلم وستم کے پینترے بدلنا نہیں بھولتے۔

کچھ مرد حضرات اپنی منکوحہ بیوی کے آنچل میں دو چار بچوں کا بوجھ ڈالے اپنی شرمناک حرکتوں کے باعث سرکاری مہمان بن کر لمبی مدت تک اپنے گھر اور بچوں سے دور ہو جاتے ہیں، ایسے میں ممتا کی ماری خلوص ومحبت کی پیکر ماں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو زمانے کے سرد وگرم جھیل کر دنیا بھر کی مصیبتوں کا سامنا کر کے جوان کرتی ہے، اس سے پہلے کہ وہ ان کی کمائی کا سکھ پاتی ان کی کمائی کا اصل حقدار ان کا باپ آن موجود ہوتا ہے، احسان مندی یا شکر گذاری کے بجائے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال میں سو سو عیب نکالتا ہے اور الزام دیتا ہے کہ انہیں ہمالیہ کی چوٹی تک کیوں نہیں پہنچایا، اُسے اپنی کوتاہی کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا، اگر کوئی شناسا اُس کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی کر دے تو بڑی ڈھٹائی سے کہتا ہے ''مردوں کو تو سو خون بھی معاف ہیں۔''

اس معاشرہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جب کوئی عورت حادثاتی طور پر لمبے عرصے تک سلاخوں کے پیچھے چلی جائے تو اس کا شوہر اس کے بچوں کو پالتے ہوئے اس کی واپسی کا انتظار کرے، مرد میں نہ اتنا صبر ہوتا ہے اور نہ ہی حوصلہ کہ وہ تنہاء بیوی کے بغیر اپنے بچوں کی پرورش کر کے حتی الامکان ان کا مستقبل بنائے۔

مرد اپنی مرضی سے ایک ساتھ کئی کئی لڑکیوں سے فلرٹ کرتا ہے، کبھی کبھی تو تمام اخلاقی حدیں بھی پار کر لیتا ہے، لیکن شادی کے لئے پاکیزہ خیالات اور باکردار لڑکی کا طلبگار ہوتا ہے، خدانخواستہ کسی باحیاء لڑکی کے ساتھ زیادتی ہو جائے تو کوئی مرد اُسے اپنانے کو تیار نہیں ہوتا، اور تو اور وہ مرد بھی اُسے قبول کرنے راضی نہیں ہوتا جس نے یہ کارنامہ انجام دیا ہو۔

سکھ دُکھ میں ساتھ دینے کا وعدہ کر کے نکاح کے بندھن میں بندھی برسوں سے وفاداری سے ازدواجی زندگی گذارتی منکوحہ اگر بدقسمتی سے تشدد کا شکار ہو جائے تو میاں کا عتاب بھی نازل ہوتا ہے اور بے چاری گھر اور بچوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتی ہے، جیسے جو کچھ بھی ہوا اس میں اس کی مرضی کا پورا پورا دخل تھا۔

کسی شریف النفس عورت کے کردار پر بدگمانی کی ایک چھینٹ بھی پڑ جائے تو اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے کہ پہلے تو اس غریب کی روح لہولہان ہو جاتی ہے، پھر وہ اس کے وجود کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا ہے۔

عورت پر چلائے جانے والے ظلم وستم کے ترکش میں تشدد کے کئی تیر محفوظ ہوتے ہیں، جسے مرد اپنی مرضی اور اپنی اُنا کی تسکین کے لئے استعمال کرتا ہے، اس معاشرے میں مردوں کے بنائے اپنے اصول ہوتے ہیں، شادی بیاہ کے مقدس بندھن کو مرد حضرات طلاق کے تین پتھر کی چوٹ سے بیوی کے وجود کے شیشے کو چکنا چور کر دیتے ہیں، اس اعزازی اختیار کے لئے انہیں کسی ضامن یا شاہد کی ضرورت نہیں ہوتی، بس جب چاہیں جہاں چاہیں اپنی

بیوی کی مقدس اور پاکیزہ چادر کو اس کے سر سے اُتار کر تار تار کر دیتے ہیں، غلطی قابل معافی ہو کہ نا قابل معافی؛ وہ اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں، یہاں انہیں نہ اپنے مالک حقیقی کا فرمان یاد رہتا ہے اور نہ ہی اس کی ناراضگی کی پرواہ ہوتی ہے، وہ تو بس اپنی اُنا کے غلام ہوتے ہیں، بے چاری عورت طلاق جیسا کڑوا گھونٹ پینے سے اس لئے بھی گریز کرتی ہے کہ اس کا راست اثر اس کے بچوں پر پڑے گا، اس کے لاکھ نہ چاہنے کے بعد بھی جب طلاق کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تو وہ اس کے اور اپنے بچوں کے لئے جہد مسلسل میں جُٹ جاتی ہے اور انہیں ان کی منزل تک پہنچا کر ہی دم لیتی ہے، اِن ناگفتہ بہ حالات میں کتنے مرد ایسے ہیں جو صبر وضبط سے کام لے کر اپنی اولاد کے لئے سعیٔ مسلسل میں لگے رہتے ہیں؛ جبکہ اَن گنت ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں عورتوں نے یہ کارنامے انجام دے کر اپنے حوصلے اور جان نثاری کے ثبوت دئے ہیں۔

مردوں کے بنائے اس سماج میں مردوں کے ظلم وستم کے مختلف عنوانات سے تنگ آ کر مظلوم اور بے وقوف عورتوں نے خودکشی کی ہے، انہیں اتنا بے بس اور مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی جیسی انمول دولت کو داؤ پر لگا کر خودکشی جیسا حرام کام کرنے سے بھی گریز نہیں کرتیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ہر خودکشی کے پیچھے ایک قاتل متحرک رہتا ہے، یہ اس کی خوش بختی ہے کہ اُسے اس جرم کی سزا نہیں ملتی اور وہ آزادانہ پھر کسی نئے شکار کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

جب سے دنیا بنی ہے معاشرے میں پلتے وحشی درندوں کی شکل میں مرد عورتوں پر زیادتی کرتے چلے آئے ہیں، اور آج کل تو یہ زیادتیاں اجتماعی شغل بنتی جارہی ہیں، دو چار افراد اپنے شغل سے فارغ ہو کر اس متاثرہ لڑکی کو ٹھکانے لگا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے، کبھی اس کی مسخ شدہ لاش کچرے کے ڈھیر میں دبا دی جاتی ہے تو کبھی وزنی پتھر باندھ کر دریا میں ڈبودی جاتی ہے، یا پھر جنگل کے جانوروں کا نوالہ بننے کے لئے اُسے جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے، شاید انہیں یہ ڈر ہوتا ہوگا کہ اگر اُسے زندہ چھوڑ دیا جائے تو وہ ان میں سے کسی ایک کی شناخت کر کے سب کو کیفر کردار تک پہنچانے کا سبب بن جائے گی، اس طرح قوم اور ملت کی ایک بیٹی، بہن، بیوی اور ماں کو اس کے مقدس رشتوں سے محروم کر کے موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔

آج کل معصوم اور ناسمجھ لڑکیاں بھی محفوظ نہیں، مدارس، ہسپتال، گھر یا بازار کہیں بھی ان کی عزت کے رکھوالے خود انہیں لوٹتے ہیں۔

میٹرنٹی ہاسپتال میں نوزائدہ بیٹیاں جنہوں نے اپنی آنکھیں کھول کر دنیا کی رنگینیاں بھی نہ دیکھی ہوں مردوں کے ظلم وستم کا ہدف بن کر اپنی زندگی گنوا بیٹھتی ہیں، بدقسمتی سے ایسے گھناؤنے فعل میں ملوث ہوتے باپ، بھائی یا شوہر کو بیٹی، بہن یا بیوی دیکھ لے تو اپنے گناہ کا نشان مٹانے کے لئے چشم دید گواہ کو ختم کر دینے میں پل بھر کی دیر نہیں لگاتے کہ انہیں اپنی زندگی پیاری ہوتی ہے کہ

پتہ نہیں ظلم وستم کے کتنے منصوبے ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں جن کی تکمیل سے پہلے انہیں مرنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔

بزرگوں کی کہاوت ہے کہ ''مرنے کے بعد بھی عورت پر تین دن بھاری ہوتے ہیں'' اس خدشہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حال ہی میں ایک قبرستان کا چوکیدار اپنے وحشی درندہ صفت دوستوں کے ساتھ مل کر ایک تازہ قبر سے لڑکی کی لاش نکال کر اُس کے ساتھ بدفعلی کرتے ہوئے پکڑا گیا۔

بنت حوا کا مردانہ سماج سے یہ سوال ہے کہ میں آخر کہاں جاؤں؟ جہاں میری عزت اور جان کو تحفظ حاصل ہو، کون سی سرزمین ایسی ہے؟ کونسا ملک ایسا ہے جہاں مجھے احترام اور تقدس کی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟ جہاں میں سر اُٹھا کر جی سکون؟ میں وہی ماں ہوں جس نے نبیوں کو جنم دیا ہے، قائداعظم اور گاندھی جی میری گود میں پل کر جوان ہوئے ہیں، داراسنگھ اور سکندر اعظم کو میں نے دودھ پلایا ہے، سرسید احمد خان، ابوالکلام آزاد اور امبیڈکر کا پہلا مکتب میری گود تھی؛ جنہوں نے بڑے ہوکر قوم وملت کے لئے علم وادب کے گہوارے بنوائے ہیں۔

جب سے دنیا وجود میں آئی ہے میرے ساتھ وہی ظلم وزیادتی ہوتی چلی آرہی ہے جس کی کوئی روک تھام نہیں، کوئی اپنے مال وزر کے نشے میں میرا سودا کرتا ہے تو کوئی طاقت کے بل بوتے پر مجھے خریدتا ہے، کوئی عالم دین منافقت کی زندگی گذارتے ہوئے پردے میں میری عزت اور ناموس کی دھجیاں اڑاتا ہے۔

دنیا کے علماء، صلحاء اور قائدین سے میرا ایک ہی مطالبہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے بااختیار لوگ مل کر کوئی ایسا قانون بنائیں کہ مجھ پر ہوے تشدد اور زیادتی کا تدارک ہوسکے، اس جرم کے مرتکب کو سنگسار کیا جائے یا بھرے مجمع میں پھانسی دی جائے کہ ان کا انجام دیکھنے والوں کو ایسی شرمناک حرکت کرنے سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑے، اس جرم کی سزاء کا خیال آتے ہی ان کی روح تک کانپ اُٹھے اور ایسے پاکیزہ ماحول سے میں اپنے ساتھ باپ' بھائی' شوہر اور بیٹے کو اپنے ساتھ جنت میں لے جاسکوں، اور یہ دنیا واقعی زمین پر بنائی ایک ایسی جنت بن جائے گی جہاں دوزخ کا تصور بھی نہیں ہوگا، چاروں طرف امن وسکون کی فضاء قائم ہوگی۔

O-O-O

مضمون نگاران سے التماس

مضامین اور شعری کلام روانہ کرنے والوں سے التماس ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا نام' بنک پاس بک کی کاپی اور مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر و فون نمبر روانہ کریں۔ ان شرائط کی تکمیل پر ہی آپ کی نگارشات قابل اشاعت ہوں گی۔

ادارہ قومی زبان

ڈاکٹر سعید بن مخاشن
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔

ممتاز مصری افسانہ نگار محمد عبدالحلیم عبداللہ کے افسانوں کا مجموعہ
''آخر شب کے خواب'' (عربی) سے ایک شاہکار افسانہ ''برکۃ مخزن القمح'' کا اُردو ترجمہ

''گندم کی برکت''

اس سال گندم کی پیداوار کم ہوئی، تنگ دل اور زیادہ تنگ دل ہوگئے، سخی کی سخاوت کم ہوگئی.

لیکن چچا عبدالعزیز جو بہت غنی النفس ہے، گندم گودام میں رکھنے سے قبل ایک بڑی مقدار اولاد کی دسترس سے دور رکھ کر حریص اہلیہ کو آواز دیکر بڑے اہتمام سے پست آواز میں کہا:

''سنو، یہ گندم ہماری نہیں خدا کی ملکیت ہے، اس کے بعض بندوں کا رزق ہے جسے ہمارے ہاتھوں تقسیم ہونا ہے، میں اور تم صرف خبر دہندہ کے مانند ہیں، کیا تم خبر رساں کو جانتی ہو؟ ہمیں یہ پیغام اور پارسل فقراء اور مساکین تک پہنچانا ہے، تم تو جانتی ہو کل صبح سویرے بعض کام سے مجھے جانا ہے اور میں چند دن بعد واپس آؤنگا۔ اب تم اس کی ذمہ دار ہو، اور ہماری کھیتی کی زکات کی تقسیم کی کفیل اور وکیل بھی ہو، کشادہ دلی سے تقسیم کرو اس سے ہمارے گودام میں برکت حاصل ہوگی.. دیر نہ کرنا..

تین کیل ام جمعہ کیلئے کیونکہ کئی یتیم بچے اسکے زیر پرورش ہیں، خدا نے ہمیں یتیموں کی مدد کا حکم دیا ہے، ایک کیل فقیہ مبروک چچا کیلئے جو نابینا ہے، استطاعت نہ رکھنے والوں کی مدد کیلئے خدا کا فرمان ہے، ایک کیل مسجد کے خادم کیلئے، کیونکہ عابد کی خدمت بھی عبادت ہے، علاوہ ازیں وہ تنگدست بھی ہے. ایک کیل ام شعبان کیلئے جس کی تمام اولاد کا انتقال ہوگیا ہے، مصیبت زدہ کی قول اور فعل سے مدد کرنا ہمارا فرض ہے.

''بیگم یہ بتاؤ اس سال کتنے کیل صدقہ ادا کرنا ہوگا؟''۔

اس نے حیرانی سے جواب دیا:

''چھ کیل گندم. یعنی آدھا اردب'' (ایک اردب ایک صاع تین کیلو ایک سو پچاس گرام کا ہوتا ہے)

انہوں نے سر کو جنبش دے کر کہا:

''یہ مال ہمارے پاس خدا کی امانت ہے''۔

آدمی کی آواز پست ہوگئی جسمیں حرص و خوف جھلک رہا تھا، جیسے کسی شخص کو ڈاکٹر فاسد کھانا کھانے سے منع کر رہا ہو، کچھ دیر بعد بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں تلوار کی طرح چمک رہی تھیں۔ رات گذر گئی اور وہ علی الصبح کام کے سلسلہ میں روانہ ہوگئے۔

چند دنوں بعد جب وہ سفر سے واپس ہوئے، سیدھے گودام جا کر گندم تلاش کیے، جب انہیں محسوس ہوا کہ وہ تو تقسیم ہو گیا ہے خدا کا شکر بجالایا اور اس بات کو بھول گئے، اور زندگی کے شب و روز میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح دو مہینہ کا عرصہ گذر گیا۔

ایک شام سورج ڈوبنے کے بعد چچا عبدالعزیز سواری پر کھیت سے لوٹ رہے تھے' ان کے پاس ایک تھیلی تھی جس میں مختلف اقسام کی ترکاریاں رکھیں ہوئی تھیں۔ انہیں دور سے ایک عورت نظر آئی جو لڑکھڑا کر چل رہی تھی اور اس کے پیچھے مختلف عمر کے تین لڑکے آ رہے تھے۔ ان تمام پر بچپن کی تازگی نمایاں تھی۔ وہ عورت بلند آواز سے گفتگو کر رہی تھی۔ یا تو وہ انہیں نصیحت کر رہی تھی یا پھر ڈانٹ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز قریب ہوتی گئی، جب اس کے اور چچا عبدالعزیز کے درمیان صرف چند میٹر کا فاصلہ باقی رہ گیا انہوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ تو ام جمعہ ہے، یتیموں کی ماں، بیمار اور تنگدست، جس کے شوہر نے زندگی کے آدھے راستے میں اسے چھوڑ کر دوسرے عالم کی راہ سدھار لی۔

وہ لڑکے کو ڈانٹ رہی تھی کہ اسے کام مہارت سے کرنا نہیں آتا ہے، اور لڑکا جواب میں آہ و بکا کر رہا تھا، اسی لمحے چچا عبدالعزیز کی سواری ان کے برابر آ گئی.

چچا عبدالعزیز نے سلام کیا، ماں نے اہتمام اور احترام کے ساتھ سلام کا جواب دیا، اور انہیں پر خلوص دعا دینے لگی'' خدا ان کی عزت سلامت رکھے، بیماریوں سے حفاظت کرے اور ان کی زندگی خوشحال رہے''۔ ماں کا لہجہ جذبات اور آنسوؤں سے پر تھا۔ شاید اس کی وجہ اس وقت اس کا بیٹا تھا جو رو رہا تھا۔

چچا عبدالعزیز نے تھیلی میں موجود تمام ترکاری اپنے اور اس ماں کے درمیان آدھی آدھی تقسیم کر دی۔ وہ مزید دعا دینے لگی'' خدا ان کی عزت سلامت رکھے اور ان کا سایہ اولاد پر باقی رکھے''۔ پھر اس کے آنسو بہنے لگے۔

چچا عبدالعزیز ایسے آدمی تھے جو اپنے صدقوں کو احسان اور تکلیف سے باطل نہیں کرتے ہیں، انہوں نے اُم جمعہ سے ڈرتے ہوئے معذرت کرتے ہوئے کہا:

'' اے اُم جمعہ جو کچھ میں نے تمہیں بھیجا ہے مجھے اس سے زاید بھیجنا چاہیے تھا، لیکن تم تو جانتی ہو اس سال پیداوار کم ہوئی ہے، لیکن کوئی بات نہیں' خدا کے ہاں کمی نہیں''.

عورت نے ترش روئی اور شدت سے جواب دیا:

'' نہیں محترم، خدا آپ کو اچھا رکھے، آپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں، میں ہمیشہ سے کہتے آ رہی ہوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں، لیکن.. آپ بہت اچھے آدمی ہیں''۔

اس کا بیٹا کچھ کہنا چاہتا تھا، ماں نے جلدی سے کندھے کو دبا کر اسے خاموش کرا دیا، اُم جمعہ کے اس عمل سے چچا عبدالعزیز کے دل میں شک پیدا ہو گیا، انہیں تصرفات میں شک ہونے لگا، وہ سیدھا گھر گئے اور کھانا تناول کیا، ان کے چہرہ سے مسکراہٹ کافور ہو گئی تھی اور وہ

کسی فکر میں مبتلا تھے، پھر انہوں نے اجازت چاہی اور گھر سے رخصت ہوگئے۔

مسجد کے دروازہ کے قریب نابینا فقیہ شیخ مبروک سے ملاقات کے بعد بے چینی سے سوال کیا:

''شیخ مبروک کیا آپ کو امانت موصول ہوگئی؟''۔

وہ ترش روئی سے ہنسنے لگے، بہت ساری باتیں کیں، وہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ پھر کہا:

''جو کچھ تمہارے پاس ہے ختم ہوجائیگا اور جو خدا کے پاس ہے باقی رہے گا''

کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا:

''حاجی عبدالعزیز آپ ہر حال میں مدد کرتے ہیں، چاہے کوئی سبب ہو یا نہ ہو۔ میں ہر روز فجر کی نماز کے بعد میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کیونکہ آپ بہت اچھے آدمی ہیں''۔ پھر وہ ہنسنے لگے جیسے کوئی محروم ہنستا ہو..وہ سمجھ گئے' گندم انہیں نہیں ملا ہے''۔

شیخ مبروک عصا سے راستہ ٹٹولتے ہوے روانہ ہوگئے، ان کی باتیں چچا عبدالعزیز کے کانوں میں گونج رہی تھیں وہ وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔ گویا چلنا بھول گئے ہوں۔

پھر چچا عبد العزیز خادم مسجد کے گھر جاکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُن کی بیوی نے دروازہ کھولا، انہوں نے دریافت کیا''کیا تمہیں امانت موصول ہوگئی؟''۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے نہیں کہا۔ اس کے باوجود اس کا تنگدست چہرہ پرسکون تھا اور وہ مسکرارہی تھی۔ اس آواز کرتے ہوئے چراغ کی روشنی میں اس پر خوشگواری کے آثار جھلک رہے تھے جس سے رات کی بادِنسیم کھیل رہی تھی.

چچا عبد العزیز وہاں سے غضبناک اور فکرمند ہوکر روانہ ہوگئے۔ اُم شعبان کے گھر گئے جس کے دونوں لڑکوں کا انتقال ہوگیا ہے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ دروازہ کھٹکھٹاتے رہے لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ رات پرسکون تھی' وہ حیا محسوس کر کے واپس چلے آئے۔

چچا عبدالعزیز عشاء کے کافی دیر بعد گھر آئے، گھر کے تمام افراد سو چکے تھے، چھت سے صرف کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں، اور مرغابی نیند میں آواز کررہی تھی۔ انہوں نے بیوی کو نیند سے بیدار کیا، وہ سمجھ گئی معاملہ اہم ہے، پریشانی سے پوچھنے لگی۔

خیریت تو ہے؟

انہوں نے کہا:

صرف خیریت ہے..دروازہ پر قرض خواہ قرض کا مطالبہ کررہے ہیں۔

اس نے تعجب سے کہا:

''قرض خواہ اصرار کررہے ہیں؟؟ یہ کیسے؟ ہم پر کسی کا قرضہ نہیں ہے''۔

انھوں نے کہا:

''معاملہ برعکس ہے، ہم پر بہت بڑا قرض ہے لیکن ہم ٹال مٹول کررہے ہیں..وہ کچھ سمجھ نہیں سکی۔ انہوں نے کہا' یقیناً

ہمیں لوگوں کا قرض یاد رہتا ہے اور ہم خدا کے قرض کو بھول جاتے ہیں، کیا تم نے خدا کے بندوں میں گندم تقسیم کر دیا؟
وہ تھوک نگلنے لگی اور کچھ جواب نہیں دیا۔
انھوں نے سختی سے بلند آواز میں کہا: جواب دو..
اس نے نفی میں سر ہلایا
''تم نے ایسا کیوں کیا؟؟ وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر ڈرتے ہوے کہنے لگی''۔
''آپ تو جانتے ہیں پیداوار کم ہوئی ہے، اور ہمارے گھر میں افراد زیادہ ہیں' اور تقسیم کیلئے آدھا اردب بہت زیادہ تھا، آپ کے جانے کے بعد میں تنگ دلی کرتے ہوئے اسے دوسرے گودام میں رکھ دیا۔ پھر وہ ڈر کے مارے وہاں سے چلی گئی۔

صبح ہوتے ہی چچا عبدالعزیز ایک ہاتھ میں کیل اور دوسرے ہاتھ میں تھیلا لے کر گندم کے گودام چلے گئے، گندم اٹھانے کیلئے طاقتور بیٹے کو آواز دیا اور پھر مستحقین میں گندم بانٹنے لگے۔
ان کی بیوی نے روتے ہوئے حیرت سے پوچھا:
''عبدالعزیز! آپ ایسا کیوں کر رہے ہو؟؟ مساکین کا حق تو صرف آدھا اردب ہے۔ آپ ایک اردب گندم کیوں گودام سے نکال رہے ہو؟؟ گندم کا موسم گذر گیا، غلہ کم ہے، کھانے والے زیادہ ہیں، ہمارے لئے بقیہ سال کیلئے کافی مقدار نہیں رہے گی''۔
چچا عبدالعزیز نے تادیب کرتے ہوے کہا:
''سنو! تم خاموش رہو، اس عمل میں سزا، صدقہ اور کفارہ شامل ہیں.. خدا کے مال میں حرص کی وجہ سے تمہیں سزا ہے، اور صدقہ اس لئے ہے کیونکہ یہ تو صدقہ ہے، اور کفارہ اس لئے کہ خدا کے بندوں کے درمیان تقسیم میں میری لاپرواہی کو خدا معاف کرے، سمجھیں تم؟؟۔ خدا پر بھروسہ کرو اور جاؤ یہاں سے''۔

اس سال گرمی کے موسم میں گاؤں کے تمام لوگ۔ بشمول چچا عبدالعزیز۔ نیل کے سیلاب کی بلندی کا چرچا کرنے لگے، کنارہ پر بسنے والے اس گاؤں کو سیلاب کی نئی موج نے آگھیرا، تمام کا شتکار دہشت اور خوف سے دیکھنے لگے کہیں وہ طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں ہے۔
ایک دن چچا عبدالعزیز ظہر کے وقت اہلیہ سے کہنے لگے:
''نیل پر مکئی کی پیداوار سے گاؤں والوں کو نقصان ہوا ہے، کیونکہ کل رات تمام کھیتوں میں پانی داخل ہوگیا ہے، مزید بتانے لگے کس طرح مکئی کے کھیت آدھے آدھے ڈوب گئے ہیں، ان کی حالت اس ڈوبنے والے کی مانند ہے جسے نہ ہی تیرا کی آتی ہے اور نہ ہی بچنے کا کوئی طریقہ۔
اہلیہ پر غم کے آثار نمودار ہونے لگے، شوہر نے خوش طبعی کرتے ہوے کہا:
تم رنجیدہ مت ہو۔ رزق کے کئی اسباب ہیں۔
بیوی نے دریافت کیا:
''یہ اسباب کہاں ہیں؟؟''
انھوں نے کہا:
''لوگ مویشیوں کیلئے ڈوبے ہوئے مکئی جمع کر رہے ہیں، کیا یہ مویشیوں کیلئے اسباب نہیں جن کا ذمہ خدا نے لیا ہے، تم فکر

نہ کرو۔

وہ پریشانی سے پوچھنے لگی:

''کیا ایک ایکڑ بھی محفوظ نہیں رہا؟؟''

انہوں نے تاکید سے کہا:

''ایک قیراط بھی محفوظ نہیں رہا..اور دریافت کرو..''

''کیا پانی مزید بلند ہوگا؟'' اس نے مزید سوال کیا، ہنستے ہوے انہوں نے جواب دیا ''چاہے زیادہ ہو یا کم ہو، جو ہونا تھا وہ ہوگیا، اس عورت کی طرح مت کرو جو شہد کی صراحی توڑ کر کوزہ پر افسوس کرتی ہے اور بھول جاتی ہے کہ زمین اس کے سامنے شہد پی رہا ہے''۔

بیوی حسرت سے کہنے لگی:

''الحمدللہ، گندم ہم نے تقسیم کر دیا، اور مکئی ڈوب گئی''۔

وہ اسکے غم کو بڑھانے کے لئے کہنے لگے:

''بالکل درست، لاحول ولاقوۃ الا باللہ، تین ایکڑ مکئی، سب ڈوب گئی، اخراجات، سب ڈوب گئے، خدا کا فیصلہ ہے''۔

بیوی نے اعتراض کرتے ہوے کہا:

''آپ مصیبت پر خوش ہو رہے ہو؟''

انہوں نے کہا:

''میں خدا کے فرمان پر خوش ہو رہا ہوں' جو تمہارے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے باقی رہے گا۔ کیا تمہیں گندم کا ایک اردب یاد ہے؟؟ وہ آج مکئی کے تیس اردب میں تبدیل ہو گئے ہیں، نیل کے کنارہ پر واقع ہماری تین ایکڑ زمین ہے، وہاں کی زمین تقریبا سیلاب کی نذر ہوگئی ہے، لیکن پانی ہمارے کھیت کیے پاس آ کر رک گیا۔ وہ اسے غرق کرنا نہیں چاہتا۔ گویا وہ بہت بلند ہے، اور پہاڑ کے مانند ہے، وہ اس سے بلند نہیں ہو سکتا، خلاص، سیلاب رک گیا ہے۔ یہ اس لئے کیونکہ میں نے خدا کو قرضہ حسنہ دیا تھا، اے تنگ دل کچھ سمجھ میں آیا.. سمجھو۔

چچا عبدالعزیز دوبارہ ہنسنے لگے۔

ان کی بیوی حیران ہوگئی، اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں' منہ کھلا رہ گیا اور کلمات جامد ہو گئے۔

○-○-○

باپ کا رُتبہ

☆ باپ کا احترام کرو تا کہ تمہاری اولاد تمہارا احترام کرے۔

☆ باپ کی عزت کرو تا کہ اس سے فیضیاب ہو سکو۔

☆ باپ کا حکم مانو تا کہ خوشحال ہو سکو۔

☆ باپ کی سختی برداشت کرو تا کہ باکمال ہو سکو۔

☆ باپ کی باتیں غور سے سنو تا کہ دوسروں کی سننی نہ پڑے۔

☆ باپ کے سامنے اونچا نہ بولو ورنہ اللہ تم کو نیچا کر دے گا۔

☆ باپ کے سامنے نظر جھکا کر رکھو تا کہ اللہ تم کو دنیا میں بلند کر دے۔

☆ باپ ایک کتاب ہے جس پر تجربات تحریر ہوتے ہیں۔

☆ باپ کے آنسو تمہارے دکھ سے نہ گریں ورنہ اللہ تم کو جنت سے گرا دے گا۔

☆ باپ ایک مقدس محافظ ہے جو ساری زندگی خاندان کی نگرانی کرتا ہے۔

oOo

ڈاکٹر علی عباس امید

اسٹار ریسڈنسی، عیدگاہ ہلز،
بھوپال 462001 (مدھیہ پردیش)

بے زمینی کا اَلمیہ

فضا خاموش ہے!

سیاہ بادلوں کا قافلہ سرخ روہوکر اس شہر سے ہجرت کررہا ہے۔ بچی کھچی نیم روشن آنکھیں ان پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ خائف ہیں ... اب یہ بادل نہ جانے کس بستی کو لہورنگ کرینگے!

فضا خاموش نہیں ہے!

ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی گرم خبریں بچے کھچے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اُتر گئی ہے ہیں، سیاہ بادلوں کا قافلہ پھر اس شہر سے ہوکر گزرنے والا ہے .... بچی کچھی سانسوں کے تسلسل میں خود بہ خود بے ربطی آنے لگی ہے۔

فضا خاموش ہے!

نیم بیدار اذہان آج ہمیشہ سے کہیں زیادہ استغراق میں ہیں۔ پہلے تو بادلوں کے کئی رنگ ہوا کرتے تھے ... سفید اودے، بھوری، کاسنی، چمپئی، نیلے۔ لیکن اب ... صرف دو ... سیاہ اورسُرخ ... سیاہ یعنی تاریکی، سرخ یعنی لہو رنگ! آخرکیوں؟ کہاں چلے گئے دل کے ساگر میں مسرت کی نرم رفتار موجیں اٹھانے والے خوش رُو بادل! کیا ہوئے روح کو سرشار کرنے والے رنگ؟ آخر کیا ہوگیا ہے کہ اب سیاہ چہرہ آنے والے بادل سرخ روہوکر جانے لگے ہیں؟ سیاہی سرخی میں تبدیل ہونے والے لمحات اس بستی کے دم واپسیں بن جاتے ہیں اور... اور... تاریکی ... لہو آلودہ اندھیرا بن جاتا ہے اس کے مقدر کے بے جان وقت کا بدترین احساس۔

فضا خاموش نہیں ہے!!!

جسموں کے اجڑے جنگل پر خاموشی کیا تیز دھوپ نے اپنے سلگتے ہوئے کھردرے پیر پھیلا دیئے ہیں۔ ہرطرف ایک طلسمی دائرہ مضبوط ہوتا جارہا ہے ...شُعاؤں کے نیزے چاند جسموں کو پار کرچکے ہیں۔ منجمد آوازیں یکلخت پگھلنے لگی ہیں، اُجالا اپنا لباس تبدیل کررہا ہے اور ... اوروہی سیاہی، سیاہی کہ حکم حاکم بہرحال بجالانا ہے۔ بچی کچھی خزاں رنگ دیواروں، دروازوں، محرابوں، کھڑکیوں اورطاقوں پر اَسپ وحشی انگارے اُگلنے والے سموں کے نشانات چھوڑ گئے ہیں۔ سمٹتی، بکھرتی اکھڑتی سانسوں کا اب نہ کوئی بدن ہے نہ چہرہ ... دیر تک نظریں گڑائے رہنے کے بعد بینائی ایک

ہیو لے سے ٹکراتی ہے، صرف ہیو لے سے ... اور کچھ بھی نہیں، کہیں بھی نہیں۔

دئے یادوں کے مدھم ہو چکے ہیں...
جو گزرا ہے اسے یکسر بھلا کر
ہم... آنے والے کل کو رو چکے ہیں
سبھی کچھ کھو چکے ہیں...

میں شاید مر چکا ہوں... لیکن، شاید نہیں... ابھی کہاں! ابھی تو مہیب تنہائی نے قطرہ قطرہ کر کے مجھے پیا ہے ... میں سرد ہوں۔ ایک دم یخ۔ اور یہ تنہائی نہ جانے کتنی تشنہ ہے، کسی صورت بجھتی ہی نہیں اس کی پیاس۔

اوہ، یہ کیسی آواز ہے... کون ہے یہ؟ یقیناً کسی نے اپنے آنسوؤں کی سرکشی سے شکست قبول کر لی ہے۔ کوئی بھی ہو بہت قریب ہے، بالکل میرے پاس... اُف... یہ تو میرے اپنے سینہ میں چھپا کوئی دھیرے دھیرے گریہ کناں ہے۔ آنسو بہانے والا کوئی اجنبی تو نہیں! نہیں وہ تو آشنا چہرہ ہے۔ یادوں کے خار ذہن کو لہولہان کر کے دل کو پارہ پارہ کرنے لگے ہیں۔ نہیں، نہیں، اب اور زخم نہیں! مجھے اپنے حافظہ کے دروازہ پر نا آشنائی کی تختی لگا لینی چاہئے، ممکن ہے یوں ہی عذاب میں تھوڑی سی کمی آ سکے۔ اس عذاب میں جو انسانوں پر آدمیوں کا لایا ہوا ہے۔

آج پھر روشنی اُداسی کا لباس پہن کر اس بستی میں داخل ہوئی ہے۔

میرے ذہن کی آنکھوں کی پلکیں ٹھہر گئی ہیں، ہر سرد لمحہ کا احساس میری پیشانی پر تیر جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے مسلسل جاگنے والی آنکھوں سے خواب روٹھ جاتے ہیں۔ یہ آنکھیں اسی لئے بے خواب ہیں، اب رہا بھی کیا ہے خواب دیکھنے کے لئے...؟ راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے، دھند ہی دھند ہے اور نیند سے بے زاری ہے۔

اُس صبح، ہاں اس خوشگوار صبح کو جب بیدار ہوا تھا تو شگفتگی نے میری نیم باز آنکھوں کے بوسے لئے تھے اور میں نے اس سے کہا تھا ''مجھ سے مت پوچھ میرے خواب کی تعبیر ابھی''۔ سچ مچ خواب تو دل کو چھو لینے والا تھا، نہ صرف خوبصورت بلکہ جینے کا حوصلہ دینے والا۔ اس میں تھا یہی شہر، اس کا شباب اور ہنستے، کھنکتے، دوڑتے، بھاگتے، اٹکھیلیاں کرتے اَن گِنت شوخ لمحے اور... اور وہ سب کچھ جو زندہ ہونے کا احساس دلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے... محبت، امن، بے نفسی، ایثار، ہمدردی، بے نیازی، قربانی... اور بھی بہت کچھ جو کہ آدمی کو انسان بننے میں معاونت کر سکیں۔

خواب گل ہے اور تعبیر جزو۔ اسی لئے اس صبح میں نے شگفتگی کو تعبیر مان لینے کی خوش فہمی نہیں پالی، کسی کی شمولیت سے بھی باز رہا۔ اچھا ہی ہوا۔ روح میں نغمگی اتارنے والے اس خواب کی روح فرسا تعبیر کون برداشت کر سکتا تھا! وہ بھی نہیں، تم بھی نہیں، کوئی بھی نہیں..... اُداسی کا لباس پہننے والی روشنی کا نزول بہر حال ہونا ہی تھا اور وہ ہو گیا۔ اس کی مایوس آنکھیں آہستہ آہستہ سرخ ہوں گی اور پھر ہمیشہ کی طرح شعلوں میں بدل جائیں گی۔ آسمان چھو لینے کی بھرپور کوشش کے بعد

دھند ہوکر ماحول کو بے نور کر جائے گی ۔ میں ! ہاں میں ! سوچتا ہوں کہ اس شہر کو چھوڑ دوں ..... لیکن کہیں کہیں کچھ آشنا چہرے دکھائی دے رہے ہیں ۔ کیا انہیں چھوڑ کر جانا خود غرضی (جو کہ اس عہد کی شناخت ہے) نہیں ہوگی ؟ مجھے یقین ہے کہ اُداسی کا لباس پہننے والی روشنی پھر آئے گی اور ان کو بھی اپنی زد میں لے لے گی ۔

اب شہر چھوڑنے کا میرا فیصلہ تذبذب کے مراحل سے دوچار ہے ۔

اچانک مجھے احساس ہونے لگا ہے جیسے واگز کی کوئی سمفنی چھیڑ دی گئی ہو ... ہاں میں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے ... میں اپنے حافظہ کے دروازہ پر نا آشنائی کی تختی لگا رہا ہوں ۔ واگز کی کوئی سمفنی چھیڑی ہوئی ہے ، موسیقی قطرہ قطرہ میرے کانوں سے گزر کر دماغ میں ہوتی جارہی ہے ... دماغ ، جس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے !

کیا میں زندہ ہوں ؟ کیا اس شہر کو چھوڑ کر میں زندہ رہ سکوں گا ؟ کیا میں زندہ رہنا چاہوں گا ؟ زندگی کیا ہے ، موت کیسی ہے یا کہ سب کچھ فریب ہستی ہے ....! موسیقی تیز ہوتی جارہی ہے ، سوالات گردش کررہے ہیں .... موسیقی اور سوالات ایک دم گڈمڈ ہوگئے ہیں .... سوالات .... موسیقی .... موسیقی .... سوالات .... موسیقی .... سوالات .... سوالات .... گردش اور صرف گردش ....

میری آنکھیں اتنی پھیل چکی ہیں کہ دونوں کناروں سے خون رسنے لگا ہے ۔ اب تو ان میں نہ اُداسی کا ملبوس پہننے والی روشنی کا عکس ہے نہ ہی شب چہرہ بادلوں کی شبیہہ ۔

فضا خاموش ہے !

فضا خاموش نہیں ہے !!

میں نے فیصلہ کرلیا ہے !

میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے !!

میں اس شہر کو چھوڑ دوں گا !

میں اس شہر کو نہیں چھوڑوں گا !!

☆☆☆

اولاد کی تربیت ۔۔۔ ارشادات شیخ سعدیؒ

شیخ سعدیؒ سے پوچھا گیا کہ اولاد کی تربیت کیسے کرنی چاہیے تو انہوں نے فرمایا:

۱۔ جب بچے کی عمر دس سال سے زیادہ ہوجائے تو اس کو نامحرموں اور ایرے غیروں میں بیٹھنے نہ دیا جائے ۔

۲۔ اگر تو چاہتا ہے کہ تیرا نام باقی رہے تو اولاد کو اچھے اخلاق کی تعلیم دے ۔

۳۔ اگر تجھے بچے سے محبت ہے تو اس سے زیادہ لاڈ پیار نہ کر ۔

۴۔ بچے کو استاد کا ادب سکھاؤ اور استاد کی سختی سہنے کا عادی بناؤ ۔

۵۔ بچے کی ضرورتیں عمدہ طریقہ پر خود پوری کرو تاکہ وہ دوسروں کی طرف نہ دیکھے ۔

۶۔ بچوں کو ہنر سکھاؤ ' اگر وہ ہنرمند ہوگا تو برے دنوں میں بھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے اپنے ہنر سے کام لے سکے گا ۔

۷۔ بچوں پر نگرانی رکھو کہ وہ بروں کی صحبت میں نہ بیٹھیں ۔

ڈاکٹر مسعود جعفری
حیدرآباد

غزلیں

اب کے اداس کر گیا ہم کو سفر بہت
حالانکہ سبز سبز تھا جنگل مگر بہت

باہر تو ایک بوند اجالا کہیں نہ تھا
قصر امیر شہر میں نور سحر بہت

ان کو کسی نے پاس بلایا نہ بات کی
انصاف کے رسول بھی ہیں در بدر بہت

یہ اور بات ہے کہ کھنڈر بن گئے محل
لیکن ہیں ترے تاج میں لعل و گہر بہت

لفظوں میں اب بیان کی طاقت نہیں مجھے
دل پر مرے پڑا ہے کسی کا اثر بہت

جیسے کسی کی یاد ستانے لگی اسے
روتا رہا ہے شام سے بوڑھا شجر بہت

شفاف آئینہ تو نہیں بن سکی غزل
شعروں میں مرے آ گیا زخم جگر بہت

تصویر تری آنکھ کے پردے پہ آ گئی
ہم رو پڑے ہیں رات میں پچھلے پہر بہت

پھر کس لئے زمین پہ تاریکیاں رہیں
ہیں آسماں پہ جعفری شمس و قمر بہت

oOo

انساں سے رویہ ترا شداد کیوں لگا
جنت نشان ملک مرا برباد کیوں لگا

کچھ لوگ مہر صبح کو آداب کہہ چکے
یہ حکم یہ دباو بھی بیداد کیوں لگا

کتنے ہی لوگ قتل ہوئے گاوں میں مرے
ہر ظلم ترا نت نئی ایجاد کیوں لگا

آنکھوں سے کوچ کر گئے آنسو ہزار ہا
ویرانہ ہائے ان دنوں آباد کیوں لگا

پگڑی ہماری گر گئی ماتم زدہ ہیں ہم
یہ سانحہ بھی ورثہ اجداد کیوں لگا

آہیں بھی لوٹ آتی ہیں ٹکرا کے ان دنوں
یہ تیرا نظم عام بھی برباد کیوں لگا

دیکھا گیا ہے آج بھی صحرا کے آس پاس
یہ جعفری بھی دور سے فرہاد کیوں لگا

oOo

انجم شافعی
حیدرآباد

غزلیں

آج سہیا ہی چکھی ہو یہ ضروری تو نہیں
چشمِ ساقی سے ہی پی ہو یہ ضروری تو نہیں
تادمِ زیست خوشی ہو یہ ضروری تو نہیں
یا ہمیشہ ہی غمی ہو یہ ضروری تو نہیں
شعر گوئی بھی ہے قدرت کی عطا اے ناداں
باپ دادا سے ملی ہو یہ ضروری تو نہیں
کسی شاعر کو بھی استادِ سخن ہونے کو
کم سے کم نصف صدی ہو یہ ضروری تو نہیں
ہیں مخالف تو مرے برسرِ نقصان مگر
چال اُن کی بھی چلی ہو یہ ضروری تو نہیں
دولت ِ علم کسی کی نہیں جاگیر میاں
جو وراثت میں ملی ہو یہ ضروری تو نہیں
ہیں زمانے صنم لاکھ حسین اور شکیل
تیری صورت ہی بھلی ہو یہ ضروری تو نہیں
کھود سکتا ہے کوئی کوہ تری اُلفت میں
خوگرِ کوہکنی ہو یہ ضروری تو نہیں
لوگ کرتے ہیں کئی غیبتیں انجمؔ کی مگر
اس کی شہرت میں کمی ہو یہ ضروری تو نہیں
ائے عدو کرنہ تو انجمؔ کی ترقی پہ حسد
تیری سازش سے رُکی ہو یہ ضروری تو نہیں

oOo

بزمِ عُشّاق سجی ہو یہ ضروری تو نہیں
عشق کی دھوم مچی ہو یہ ضروری تو نہیں
ہر نظر تجھ پہ جمی ہو یہ ضروری تو نہیں
تو ہی اک سبز پری ہو یہ ضروری تو نہیں
اپنے فن میں کئی فنکار ہیں ماہر' ہر سو
اُن کی شہرت بھی ہوئی ہو یہ ضروری تو نہیں
وہ جو فرقت میں ملیں ہم سے تعجب کیا ہے؟
ہجر کی شام ڈھلی ہو یہ ضروری تو نہیں
تو مرے غم میں ہے 'غمگین' ہے چہرے سے عیاں
تیری آنکھوں میں نمی ہو یہ ضروری تو نہیں
تیرے پیکر کو میں خوابوں میں سجالیتا ہوں
تو تصوّر میں بسی ہو یہ ضروری تو نہیں
راگ بھر برق کڑکتی تو رہی ہے لیکن
آشیانوں پہ گری ہو یہ ضروری تو نہیں
دل جو آجائے کسی پر تو محبت ہوگی
سابقہ دل کی لگی ہو یہ ضروری تو نہیں
عشق کی آگ میں سوزاں ادھر ہے انجمؔ
آگ اُس سمت لگی ہو یہ ضروری تو نہیں
شعر گوئی ہے تری کیفِ غزل ائے انجمؔ
یہ تصنّع سے بھری ہو یہ ضروری تو نہیں

oOo

اقبال شیدائی
ورنگل

24-1-34/C، سرورنگر، درگاہ روڈ
قاضی پیٹ، پوسٹ این۔ٹی۔1، ورنگل 506004 (تلنگانہ)

غزلیں

جو بات عجز و مروت، خلوص، پیار میں ہے
کہاں وہ بات کدورت، عناد و عار میں ہے
مجھے یہ ناز کہ درویشِ کج کُلاہ ہوں میں
اُسے یہ زعم کہ اُمرائے شہریار میں ہے
وہ جانتا ہے خدا کو پسند ظلم نہیں
یہ ڈھا رہا ہے مظالم کہ اقتدار میں ہے
اُٹھائی جس نے قسم مجھ کو بھول جانے کی
سنا ہے کل سے وہی میرے انتظار میں ہے
میں انتقام کے بدلے معاف کرتا ہوں
خلوص و مہر تو شامل مرے شعار میں ہے
وہ جس کے ہجر میں بالوں میں برف جمنے لگی
نہ جانے شخص وہ غربت کے کس دیار میں ہے
جو میری جان کا دشمن ہے نفسِ امّارہ
وہ میرے بس میں ہے لاریب! اختیار میں ہے
جتن مٹانے کا اُس کو ہے لغو شیدائی
جو شخص سایۂ الطافِ کردگار میں ہے

oOo

دیر سے ہوتا ہے ہر چند مگر ہوتا ہے
دل سے مانگیں جو دعائیں تو اثر ہوتا ہے
ہم تو انساں ہے ٹھکانہ بھی کوئی ذاتی ہو
ایک بودا سہی مکڑی کا بھی گھر ہوتا ہے
آپ کیوں دیکھ کے دہشت زدہ ہوجاتے ہیں
دل ہے، اکثر ہی مرا زیر و زبر ہوتا ہے
جلد گر چاہیے منزل تو رکھو کم ساماں
اس سے آسان تمنّا کا سفر ہوتا ہے
جس کا ایمان ہو پختہ تو عقیدہ راسخ
راہِ ہستی میں اُسے کب کوئی ڈر ہوتا ہے
اپنے سائے میں سمولیتا ہے ہر شخص کو وہ
سایہ دار اتنا محبت کا شجر ہوتا ہے
ہم کو ملنی ہے خوشی گر تو ملے گی پھر بھی
ہم کو دنیا میں کہا ں غم سے مفر ہوتا ہے
اُس کے قدموں ہی کو چومے ہے ظفر شیدائی
جس کے سینے میں عزائم کا شرر ہوتا ہے

oOo

کوکب ذکی
9-11-39/5، قاضی گلی
قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد

غزلیں

انا سے تکبر سے عار کرلینا
تم اختیار سدا انکسار کرلینا
وہی کریم ہے رزاق ہے رحیم بھی ہے
ہمارا فرض ہے بس اعتبار کرلینا
بہت دلا ر ہے اولاد سے تمہیں لیکن
کسی یتیم سے تھوڑا سا پیار کرلینا
زمانے بھر کی نگاہوں سے بچ کے آنا ہے
اگر ہو دیر تو تم انتظار کرلینا
مجھے ہے یاد ابھی، ابتدائے اُلفت میں
وہ تیری یاد میں دل بیقرار کرلینا
جو اشک میں نے بہائے تمہاری فرقت میں
تم اُن کو درد کے گوہر شمار کرلینا
شجر سے برگ کا جھڑنا رُکے جو گلشن میں
''یقین آمدِ فصلِ بہار کرلینا''
تمہارے خُلق کی دنیا مثال دینے لگے
تم ایسا طرز ذکی اختیار کرلینا

oOo

من گھڑت بات گھڑی جائے تو گھڑ جانے دو
بے سبب گر کوئی اکڑے تو اکڑ جانے دو
جس میں مسکین کو رہنے کی جگہ بھی نہ ملے
ایسی دنیا اگر اُجڑے تو اُجڑ جانے دو
حاکمِ وقت کے تیور کا مجھے خوف نہیں
بگڑیں تیور اگر اُس کے تو بگڑ جانے دو
میرا ایماں ہے کشتی کا محافظ ہے خدا
ناخدا مجھ پہ جو بگڑے تو بگڑ جانے دو
آندھیوں نے یہ کہا ہے کہ بدلیں گے روش
ناتواں پیڑ اگر اُکھڑیں تو اُکھڑ جانے دو
فیصلہ یہ نہیں بدلیں گے بدل جائے جہاں
عدل و انصاف گر اڑتے ہیں تو اڑ جانے دو
ساتھ میں حق کے رہوں بھائی کی پروا نہ کروں
گر گرہ پڑتی ہے رشتوں میں تو پڑ جانے دو
تم صداقت کی ذکی شمع جلاتے رہنا
شبِ ظلمات گر اکڑے تو اکڑ جانے دو

oOo

کشورؔ سلطانہ
حیدرآباد

غزلیں

شکلِ خزاں بدل گئی جب پھول ہنس پڑے
یہ شامِ غم بھی ڈھل گئی جب پھول ہنس پڑے
کیا حُسن تیرا بڑھ گیا ماہ و نجوم سے
گویا کرن مچل گئی جب پھول ہنس پڑے
یہ جانفشانی عشق کی کیا کام کرگئی
یہ زندگی بدل گئی جب پھول ہنس پڑے
اب وقت سے مقابلہ ہر ہر قدم پہ ہے
گر کر فضا سنبھل گئی جب پھول ہنس پڑے
دیکھی جو ہم نے زندگی دن میں بھی شب میں بھی
یوں شمع بھی پگھل گئی جب پھول ہنس پڑے
جو فصلِ نو بہار ہے کشورؔ کے صحن میں
اُس سے صبا مچل گئی جب پھول ہنس پڑے

oOo

آنکھیں آنکھیں، آنسو آنسو
قطرہ قطرہ مہکی خوشبو
رشکِ قمر کا جلوہ ایسا
چاندنی پیاری پھیلی ہر سُو
بھیگی بھیگی، بکھری زُلفیں
گویا جاگے رات کا جادو
گلشن گلشن مہکی بیلا
صحرا صحرا پھیلی خوشبو
تارے فلک کے تیری منزل
رات اندھیری، چمکے جگنو
شیشہ، شبنم، ہیرا موتی
شعر ہے کشورؔ تیرا جادو

oOo